دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۷ ماہ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۱۱ء عدد ۳

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

ترکی میں تحریکِ احیاءِ اسلام کے بانی، داعی اور نقیب پروفیسر نجم الدین اربکان (Necmettin Erbakan) نے ۲۷فروری کو ۸۵ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی پیدائش (۲۹ اکتوبر ۱۹۲۶ء) سے دو سال پہلے ترکی میں عثمانی خلافت کا خاتمہ کیا جا چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک عہد کو دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ اللہ نے انہیں ایک نئے دور کے معمار ہونے کی سعادت بخشی۔ انہوں نے اس مذہب بیزار نظریہ حکومت کو چیلنج کرنے کا حوصلہ کیا اور اپنی آنکھوں سے اس جدوجہد کو کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ اگر ان کے فکری ارتقاء کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اپنے عظیم ورثہ سے محرومی کے شدید احساس اور اس کی بازیافت کی تڑپ نے ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا اور وہ اس ماضی کی روشن روایتوں کے امین تھے جس کے آخری نشانات کو بھی ترکوں کے ذہن و دماغ سے کھرچ پھینکنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ چنانچہ جب ان کے انتقال پر ترکی کے مشہور روزنامہ 'حریت' کے تجزیہ نگار نے ان کو عثمانی شرافت کا مجسمہ قرار دیا تو وہ غالباً ان کی شخصیت کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

پروفیسر نجم الدین اربکان نے نئے ماحول اور نئے تقاضوں کے تحت تعلیم حاصل کی لیکن اسلام سے وابستگی جو ابتدائی تربیت کی دین تھی اس طرح ان کی شخصیت میں رچ بس گئی تھی کہ کوئی اور رنگ اس رنگ پر غالب نہ آ سکا۔ وہ ایک کامیاب انجینئر اور سائنسداں، ماہر تعلیم اور اعلی درجہ کے سیاست داں تھے۔ انہوں نے استانبول ٹیکنیکل یونیورسٹی (ITU) سے ۱۹۴۸ میں ماسٹرس کی ڈگری حاصل کی۔ اعلی تعلیم کے لیے جرمنی گئے اور وہاں آخن یونیورسٹی (Aachen University) سے انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی تفویض ہوئی۔ انہوں نے کچھ دنوں جرمنی کی وزارت دفاع میں بھی کام کیا۔ وہ اس ٹیم میں چیف انجینئر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے جس نے جرمنی کا مشہور ٹینک لیوپارڈ (Leopard) ڈیزائن کیا تھا۔ جرمنی سے واپسی کے بعد وہ بعض صنعتی اداروں سے وابستہ رہے۔ کئی مصنوعات کی ایجاد کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ انہوں نے اس دوران چیمبرس آف کامرس کے صدر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ تدریسی کیریر کا آغاز انہوں نے استانبول ٹیکنیکل یونیورسٹی سے کیا جہاں ان کو ۱۹۶۵ میں پروفیسر مقرر کیا گیا۔ ترکی کی سائنسی اور صنعتی ترقی میں، جس پر جدید ترکی کی معاشی خوش حالی کا دارومدار ہے، ان کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ لیکن ان کا اصل

کارنامہ ترکی میں احیاء اسلام کے لیے ان کی ناقابل فراموش خدمات ہیں۔ مصطفی کمال پاشا اور ان کے جانشینوں نے ترکی میں جس سیکولر معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کی تھی اس کا خمیر مذہب بیزاری اور اسلام دشمنی سے اٹھایا گیا تھا۔ اس میں اسلام سے وابستگی کا اعتراف و اظہار جرم کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایسے ماحول میں اسلام کے احیاء کی بات کرنا اور اس کے لیے جدوجہد کرنا آسان نہیں تھا۔ اسی ناممکن کو ممکن بنانے کی جدوجہد سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ عالم اسلام میں آج ترکی کو ایک قائدانہ مقام حاصل ہے۔ عالم عرب کی موجودہ صورت حال کے تناظر میں ترکی کا نام ایک ماڈل کی حیثیت سے لیا جارہا ہے۔ اس مقام و مرتبہ تک پہنچنے میں ترکی سب سے زیادہ اسی بطل جلیل کا مرہون منت ہے۔

تعلیم و تدریس اور سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں اپنی مصروفیات اور اکتسابات کے باوجود وہ ملک میں پائی جانے والی صورت حال اور اس کی اصلاح کی ناگزیر ضرورت سے غافل نہیں رہے۔ طویل غور و فکر کے بعد انہوں نے احیاء اسلام کے مقصد سے ایک لائحہ عمل تیار کیا اور اپنی پوری زندگی اس کو عملی جامہ پہنانے میں گذاردی۔ اس سلسلہ میں عملی اقدام کا آغاز انہوں نے ۱۹۶۹ء سے کیا۔ اسی سال انہوں نے ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے پارلیمنٹ کے الکشن میں حصہ لیا اور رکن پارلیمان منتخب ہوئے۔ اسی سال انہوں نے ملی گوروس (Milli Gorus) یا ملی نقطہ نظر کے نام سے وہ منشور شائع کیا جس نے نہ صرف ملک کے اندر بلکہ ملک سے باہر آباد ترکوں کے ذہن و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ملی گورس نے دراصل ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی تھی اور ملک سے باہر خاص طور پر جرمنی میں آباد ترک باشندے آج بھی بڑی تعداد میں اس سے وابستہ ہیں۔ اس تحریک کے ذریعہ کئی ایسے ادارے وجود میں آئے جو خدمت خلق کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ لیکن اس تحریک کے ذریعہ پروفیسر اربکان جو بنیادی مقصد حاصل کرنا چاہتے وہ یہ تھا کہ ترکی کی سیاسی زندگی میں اسلام کے لیے جگہ پیدا کی جائے۔ اس میں قوم اور ثقافت کے الفاظ دراصل اسلام کے لیے استعمال کیے گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ترکی کی سیاست میں اسلام کا استعمال غیر قانونی تھا۔ اس میں اخلاقی تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعتی اور معاشی ترقی پر بہت زور دیا گیا تھا۔ ترکی میں اسلام کے خلاف جو کچھ ہوا تھا وہ مغربی افکار اور نظریات کے زیر اثر ہوا تھا۔ اس لیے فطری طور پر اس میں مغرب مخالف جذبات کا پرتو نمایاں تھا۔ ترکی میں اسلامی سیاسی پارٹی کا قیام پروفیسر اربکان کی اولیات میں شامل ہے۔ انہوں نے نصف صدی

پر محیط اپنی سیاسی زندگی میں متعدد پارٹیاں بنائیں۔ ۱۹۷۰ میں انہوں نے ملی نظام پارٹی کے نام سے اپنی پہلی سیاسی پارٹی بنائی۔ اس کے بعد ملی سلامت پارٹی، رفاہ پارٹی اور آخر میں سعادت پارٹی بنائی۔ سعادت پارٹی کے علاوہ باقی تمام پارٹیاں مختلف اوقات میں ممنوع قرار پاتی رہیں۔ کئی بار ان کے اوپر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر پابندی لگائی گئی۔ ۱۹۹۶ء میں رفاہ پارٹی پارلیمنٹ میں سب سے بڑی پارٹی کی شکل میں منتخب ہوئی اور پروفیسر نجم الدین اربکان وزیر اعظم مقرر ہوئے اور اس طرح انہوں نے ایک نئی تاریخ رقم کی۔ لیکن ان کی اسلامیت فوج کے لیے ناقابل برداشت قرار پائی اور محض ایک سال بعد انہیں اپنے عہدے سے دست بردار ہونا پڑا۔ ان کی پارٹی ممنوع قرار پائی اور ان کے سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کردی گئی۔ اپنی مختصر حکومت کے دوران انہوں نے اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے میدان میں اہم اقدامات کیے۔ اسلام کی طرف واپسی کے علاوہ صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے مقصد سے دور رس اہمیت کے اقدامات کیے گئے۔ وہ یوروپین کامن مارکٹ کو ترکی کے تشخص کو ختم کرنے کے لیے عیسائی اور صہیونی منصوبہ کا حصہ سمجھتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں انہوں نے اہم اسلامی ممالک کا ایک بلاک D-8 کے نام سے قائم کیا جس میں ترکی کے علاوہ ایران، ملیشیا، انڈونیشیا، مصر، بنگلہ دیش، پاکستان اور نائیجیریا شامل تھے۔ اپنے قدیم ورثہ کی بازیافت، اسلامی ممالک سے قریبی تعلقات کی استواری اور اسرائیل اور یوروپ دشمنی ان کی پالیسی کے بنیادی عناصر تھے۔ رفاہ پارٹی کے ممنوع ہونے کے بعد ان کے کچھ ہم نواؤں نے جنہوں نے انہی کی تربیت اور رہنمائی میں سیاست کا سبق پڑھا تھا موجودہ وزیر اعظم رجب طیب اردگان کی قیادت میں جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی (AKP) بنالی۔ جناب اربکان اس کو صہیونی سازش کا حصہ قرار دیتے تھے۔ پروفیسر اربکان سے بعض بنیادی امور میں اختلاف کے باوجود گذشتہ چند برسوں میں طیب اردگان کی قیادت میں ترکی نے احیاء اسلام کے محاذ پر جو غیر معمولی پیش رفت کی ہے اس سے شاید یہ نتیجہ نکالنا نامناسب نہ ہو کہ یہ قدم ملک میں پائی جانے والی صورت حال کے تناظر میں اسلام کی خدمت کے مقصد سے اٹھایا گیا تھا۔ صدر عبد اللہ گل اور وزیر اعظم طیب اردگان دونوں پروفیسر اربکان کے تربیت یافتہ ہیں اور انہیں ہوجہ (Hoca) یعنی استاد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ بلاشبہ اسلام کی شیدائی نئی ترک نسل کے استاد اور ترکی میں احیاء اسلام کے ہر اول دستہ کے قائد تھے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

مقالات

آنحضورﷺ کی سیرت طیبہ پر یورپین تصانیف

ڈاکٹر محمد حمادہ
ترجمہ: ڈاکٹر محمود الحسن عارف*

(۲)

(سلسلہ کے لیے معارف ستمبر ۲۰۱۰ء دیکھیے)

۴-مغرب میں سیرت نگاری کا دور جدید (انیسویں صدی اور مابعد کا دور)

۱- گوئٹے نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق انصاف پر مبنی جو تخم ریزی کی تھی اور اس بارے میں جن سچے خیالات کا اظہار کیا تھا، اس کا مکمل اظہار معروف انگریز ادیب کارلائل کے ایک لیکچر سے ہوا، جو اس نے Hero as Prophet کے عنوان سے ۱۸۳۷ء میں پیش کیا تھا، یہ مقالہ مغرب میں مطالعہ اسلام کے ایک نئے دور کا دیباچہ ثابت ہوا۔

کارلائل کہتا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم پیغمبر اسلام کی قدر و قیمت کا بہتر انداز میں اور جرات کے ساتھ اندازہ لگائیں، جب کہ قدیم زمانے کے لوگ رسول اکرم ﷺ کو محض ایک وحشی عبقری قرار دیتے تھے۔(۱) لیکن جدید دور (Romantic age)، جس کی انیسویں صدی عیسوی سے ابتداء ہو چکی ہے اور عالم شرق جو پہلے بے کس تھا اب جدید خیالات کو پھیلانے والا اور مغرب پر اپنے اثرات ڈالنے کے قابل ہو گیا ہے (۲) اس طرح کے خیالات کو قبول نہیں کر سکتا۔

دراصل کارلائل، گوئٹے کو بے حد پسند کرتا تھا، اسی لیے وہ اپنے اس لیکچر میں گوئٹے کے اس قول کا حوالہ دیتا ہے، ''اگر یہی اسلام ہے تو کیا ہم سب اسلام میں نہیں جی رہے؟'' چنانچہ

ریاض، سعودی عرب۔ *دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

کارلائل، گوئٹے کے زیر اثر رسول اکرم ﷺ کو ایک ایسا عظیم دینی قائد قرار دیتا ہے جنھوں نے بشریت کی اللہ تعالیٰ کی طرف، جو سب سے بلند و بالا اور قدرت والا ہے، رہنمائی کی ہے۔

اسی لیے سیرت طیبہ پر قلم اٹھانے والے تمام مسلمان مصنفین نے کارلائل اور اس کی بعض تحریروں کی تعریف کی ہے۔

۲-۱۸۴۳ء میں (Gusta weil) نے ''محمدؐ الرسول حیاتہ وتعالیمہ'' لکھی۔ (۳)

۳-فرانسیسی مولف کوزن دی پرسیول (Coussin de perceval) نے ۱۸۷۷ء میں ''تاریخ العرب العام'' لکھی جس میں اس نے ایک مقالہ بعنوان ''مقالہ عن تاریخ العرب'' (Essai Sur of histoire) لکھا، جہاں اس نے متعدد صفحات میں نبی اکرم ﷺ کی سیرت بھی تحریر کی ہے۔ (۴)

۴-اس طرح ایک یہودی مصنف (Abraham Geiger) نے ۱۸۳۳ء میں ایک کتاب لکھی، جس میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ محمدؐ نے اپنی دعوت کے اساسی اصول کہاں سے لیے؟ پھر خود ہی اس کا جواب دیا کہ آپؐ نے یہودیت سے استفادہ کیا ہے۔

انیسویں صدی میں منظر عام پر آنے والی تین اہم کتابیں:　　انیسویں صدی میں جو تین اہم کتابیں سیرت طیبہ پر لکھی گئیں۔ ان میں سب سے پہلی کتاب:

۵-الویو سپرنگر (Aloyo Sprenger) کی تصنیف ہے جو ایک عرصے تک ہندوستان میں رہا اور نبی اکرم ﷺ کی زندگی اور ظہور اسلام کے متعلق بہت سے عربی متون دریافت کیے، اسی لیے ان موضوعات پر لکھنے کا وہ پوری طرح اہل تھا، چنانچہ اس نے آنحضور ﷺ اور اسلام کے متعلق کئی کتابیں تصنیف و تالیف کیں، جن میں ایک کا نام ''حیاۃ محمدؐ من المصادر الاصلیۃ'' ہے جو ۱۸۴۷ء میں طبع ہوئی۔ ولیم میور اس کتاب کی بے حد تعریف کرتا ہے۔ (۵)

۶-لیکن بعد ازاں مولف نے اپنے یہ افکار تبدیل کر لیے اور حیاۃ محمدؐ و تعالیم محمدؐ (۳ جلدیں برلن)؛ محمدؐ والقرآن...... دراستہ سیکولیجیۃ (ہمبرگ ۱۸۸۹ء) جیسی کتب تحریر کیں۔

سپرنگر پیشے سے ڈاکٹر اور ذہنی طور پر ایک عیسائی تھا، اسی لیے جب اس نے حدیث کی کتابوں میں یہ پڑھا کہ رسول اکرم ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کی پیشانی عرق آلود

ہو جاتی تھی، تو اس سے اس بدبخت کو یہ خیال آیا کہ یہ تو صرع (مرگی) کی ایک قسم ہے، مگر اس بدطینت نے یہ نہیں سوچا کہ کبھی کسی مرگی کے مریض سے ہیروں اور موتیوں سے زیادہ آب و تاب رکھنے والے، وحی کے الفاظ کی چمک دمک نظر آئی ہے چنانچہ اس نے اپنی پہلی کتاب میں اس کیفیت کی توضیح کرنے کی کوشش کی ہے، وہ اسلام اور قرآن دونوں کے متعلق آنحضورﷺ کو ذمہ دار (مسئول) ٹھہراتا ہے، جو اس کی مسیحی سوچ کا نتیجہ ہے، البتہ اس نے اسلام کی اہمیت اور عالمی تاریخ میں نبوی کردار کو بھی عمدہ انداز میں بھی واضح کیا ہے۔

دوسری کتاب "حیاۃ وتعالیم محمدؐ" میں اس نے اسلام کے ادبی، اجتماعی، دینی اور سیاسی ارتقاء کو واضح کیا ہے، سپرنگر کے اس انداز کو پیتھالوجیکل Pathalogical school کا نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔

۸-اس صدی میں سامنے آنے والا دوسرا بڑا کام سکاٹ لینڈ (برطانیہ) سے تعلق رکھنے والے، متعصب اور ولیم میور کا ہے، جس نے اسی زمانے میں حیاۃ محمدؐ (Life of Mohammed) لکھی (لنڈن ۱۸۵۶-۱۸۶۱) (چار جلدیں)۔ مولف کی زندگی میں یہ کتاب تین مرتبہ طبع ہوئی، آخری بار ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی، اس کتاب کو مشرق و مغرب میں وسیع پیمانے پر شہرت ملی۔ یہ کتاب لگ بھگ ۸۰ سالوں تک یورپ میں رسول اکرمﷺ پر ہونے والے تحقیقی کاموں کے لیے بنیادی ماخذ کے طور پر مقبول اور متداول رہی۔

اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ میور ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی طرف سے اہم ترین عہدے پر فائز رہا، مصنف کو مشرقی علوم وفنون سے خصوصی دلچسپی تھی۔

اس کے پاس مشرقی کتب اور ان کے تراجم کا وافر ذخیرہ موجود تھا۔ (۶) اس نے قریب قریب انہی کتابوں سے استفادہ کیا، جن سے سپرنگر نے استفادہ کیا تھا لیکن میور نے تمام بنیادی ماخذ سامنے رکھنے کے باوجود ایک ایسے متعصب عیسائی کے طور پر کتاب لکھی، جو روشنی اور بصیرت کی طرف سے مکمل طور پر محروم ہو اس نے آنحضورﷺ کو نبی غیر صادق ثابت کرنے اور اسلام اور قرآن میں تناقضات واضح کرنے پر پوری مہارت صرف کی ہے۔ (۷) یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ مصنف عیسائیوں کی مشنری تنظیم کا رکن تھا اور اس نے مشنری مقاصد کی

تکمیل کے لیے یہ کتاب مرتب کی۔ یہ کتاب ایسے مشنریوں کی کتاب کے طور پر سامنے آئی، جو حقائق کو بھرپور طریقے سے بدلنے کی عیارانہ کوشش کرنے اور ہندوستان کو مسیحی ملک میں تبدیل کرنے کی مکارانہ سازش میں مصروف رہے۔

میور کا گمان ہے کہ اسلام مسیحیت کی اشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور عیسائی مذہب کے لیے اس کو ختم کرنا بے حد مشکل ہے، اسی لیے کسی بدباطن خبیث عیسائی پادری کی روح جوش مار کر باہر نکل آتی ہے اور وہ محمد ﷺ اور اسلام کی مخالفت میں بے قابو ہو جاتا ہے، حالانکہ اس نے متعدد بار یہ بھی لکھا ہے کہ محمد مخلص اور سچے انسان تھے، یہ اور بات ہے کہ مکی دور میں آپ ﷺ میں اخلاص بڑا واضح نظر آتا ہے، مگر مدنی دور میں اسے آپ ﷺ کے اخلاص میں کمی نظر آتی ہے، وہ لکھتا ہے کہ قاری خود اندازہ لگا لے گا کہ کس طرح اعلیٰ ترین روایات کو تبدیل کیا گیا۔ (العیاذ باللہ)

۹- اس دور کا تیسرا مستشرق نولا کہ تھا، جس نے رسول اکرم ﷺ پر کئی کتابیں اور مقالات لکھے، لیکچر دیے، مگر وہ سپرنگر اور ولیم میور کے مقابلے میں اسلام اور پیغمبرؐ اسلام پر تنقید کرنے میں کافی محتاط رہا، اس کی کتاب تاریخ القرآن (برلن ۱۸۷۵ء) اس موضوع کے مطالعے کے لیے ایک بنیادی کتاب ہے۔ اس تصنیف کو سوا سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اس کے باوجود یہ کتاب رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ اور اس کے ماخذ کے طور پر ایک اہم تصنیف تصور ہوتی ہے، نولا کہ پہلا یورپی مصنف ہے جس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سیرت کی کتابیں واقعات اور حوادث کا اس طرح ذکر نہیں کرتیں جس طرح کہ وہ پیش آئے تھے، بلکہ وہ تاریخ نگاری کے اس طریقے کی پیروی کرتی ہیں، جو اس دور میں عام تھا۔ (۸)

۱۰- نولا کہ کی رسول اکرم ﷺ کی زندگی کے متعلق ایک دوسری کتاب Das leben Narh der Queller Populer dargestellt (ہانوفر ۱۸۶۳ء) ہے۔

۱۱- اس کی ایک اور کتاب Muhammad ہے جو سطحی سی تصنیف ہے۔ اور اب وہ بھلا دی گئی ہے۔ نولا کہ جب یہ اقرار کرتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ اپنی رسالت کے عقیدے میں صادق تھے تو وہ سختی کے ساتھ اس بات کی تردید کرتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو کسی طرح کی مرگی (صرع)

کے دورے پڑتے تھے، اس کا گمان تھا کہ آپ پر طاقتور اندرونی جذبات کی آمد ہوتی تھی۔

مغرب میں حدیث شریف پر تنقید کا آغاز وارتقاء: مغرب نے احادیث مبارکہ کی صحت پر ہمیشہ شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے اور ان پر تنقید کا سلسلہ اسی صدی میں شروع ہوا۔

۱۱- سب سے پہلا مستشرق جس نے احادیث کی صحت پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا وہ جرمن عالم نولاکہ ہے جو ان کو بطور ماخذ استعمال کرنے کا منکر تھا لیکن پہلا شخص جس نے مغرب میں یورپی نقطۂ نگاہ سے بحث وتنقید کا آغاز کیا وہ گولت سیہر (Ignac Goldziher) ہے۔ جس نے اپنی تحریروں میں احادیث کے کمزور اور مشکوک ہونے کا نظریہ پیش کیا۔ وہ ایک متعصب یہودی مستشرق تھا اسی لیے اسلام اور پیغمبر اسلام کا سخت مخالف تھا، اس نے اپنے تعصب اور عداوت کو بحث وتنقید کے پردے میں چھپا کر پیش کیا۔

اس کے خیال میں احادیث کی تدوین ایک صدی بعد شروع ہوئی، بہت سی احادیث میں قرآن کی وضاحت یا اس کی تائید والے اوصاف نہیں پائے جاتے، فقہاء اور برسر اقتدار حکمرانوں نے ان پر اثر ڈالا ہے، اس نے سیرۃ نبوی پر بھی ان خیالات کا اطلاق کیا ہے اس کا خیال ہے کہ محض سند کسی حدیث کی صحت یا اس کے ضعف کی دلیل نہیں ہوسکتی۔

اس نے امام ابن شہاب الزہری پر یہ الزام عاید کیا ہے کہ وہ حکمرانوں کی خوشنودی کے لیے احادیث گھڑا کرتے تھے۔

۱۲- اس موضوع کو اس سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ ہنری لامینس (Henry Lammens) مستشرق نے پیش کیا، اس نے کئی مقالات لکھے لیکن وہ یہ ثابت نہیں کرسکا کہ سیرت طیبہ سے متعلق جملہ روایات خصوصاً قبل از ہجرت دور کی روایات کی کوئی اساس نہیں ہے جبکہ ایک دوسرے مستشرق ہر میکر نے ہنری لامینس کے مقابلے میں، ان روایات پر وضع کا الزام لگایا ہے۔

اس کے خیال میں سیرت کی تفصیلات کے لیے یہ مستقل تاریخی مصدر نہیں، یہ تو محض احادیث ہیں، جنہیں سیرت کی شکل دے دی گئی ہے، اس کے خیال میں احادیث یا تو قرآن کریم کے کسی اشارے کی وضاحت کرتی ہیں یا پھر کسی نئے فقہی حکم پر دال ہیں۔(۹)

لامینس اور گولت سیہر نے اس تنقید کو ''تنقید مصادر'' قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ مکی عہد مکمل

طور پر مسلمان سیرت نگاروں کی اختراع ہے، جس کی بنیاد صحت پر نہیں ہے، اس کی فکر کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ وہ حضرت خدیجہؓ سے آپ کی نرینہ اولاد کے بارے میں بھی شک وشبہ کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ حضرت خدیجہؓ کی ان کے سابقہ شوہروں سے اولاد تھی، لامینس اسلام کو ایک بڑا تاریخی حادثہ قرار دیتا ہے۔(۱۰)

تاہم وقت کے ساتھ ساتھ ان تینوں کتابوں کی اہمیت کم ہوگئی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں سیرت طیبہ پر مغرب میں بے شمار کتب لکھی گئیں لیکن اب ان کی اہمیت وہ نہ تھی، جو سابقہ دور میں اس نوع کی کتابوں کی ہوتی تھی، ان کتب میں:

۱۳- جانسن کی کتاب ''محمدؐ وقوتہ''۔　　　۱۴- سیل (sell) کی حیات محمدؐ۔

۱۵- وولاسٹون (Wollaston) کی محمدؐ حیاتہ وعقیدتہ۔

۱۶- واشنگٹن اروبخ کی حیات محمدؐ۔　　　۱۷- ہیلر (St. Helaire) کی محمدؐ والقرآن۔

۱۸- شولٹ (Scholt) کی الاسلام وموسسہ: دراستہ اخلاقیۃ۔

۱۹- رینہ کی محمدؐ والاسلام۔　　　۲۰- ریکندورف (Aeckendor) کی محمدؐ وتعالیمہ۔

واشنگٹن نے اپنی کتاب (محمدؐ وتعالیمہ) کے لیے ویل کی کتاب ''محمدؐ وخلفاءہ'' پر اعتماد کیا، اس کتاب کو کافی شہرت ملی اور اس کا فرانسیسی، اطالوی اور عربی میں ترجمہ ہوا، اس کتاب میں مولف نے یہ دعوی نہیں کیا کہ اس نے سیرۃ نبوی پر علمی انداز میں کام کیا ہے یا اس نے نئے حقائق پیش کیے ہیں یا وہ بہت گہرائی میں گیا ہے (دیکھیے ص ۸) اور وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس کی کتاب ماخذ کے طور پر سامنے رکھی جائے بلکہ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ اسے اب تک ہونے والے کام کا ماخذ سمجھا جائے۔

لامینس جس کا سطور بالا میں ذکر ہے، شام اور لبنان کا رہنے والا دراصل ایک کیتھولک پادری تھا، بے حد متعصب تھا اور ۱۹۱۸ء میں شام پر فرانس کے قبضے کے بعد، وہ فرانسیسی قبضے کا موید وحمایتی بن گیا تھا، اس نے اپنے تعصب کو تاریخی بحث وتحقیق کے پردے میں چھپا کر پیش کیا ہے اور تنقید کے من گھڑت اصول لکھ کر قرآن اور احادیث پر انہیں منطبق کیا ہے۔

۲۱- جرمن مستشرق ہبرٹ گریمن (Hbbert Grimine) نے رسول اکرم ﷺ اور ظہور اسلام کے متعلق ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۵ء کے درمیان دو کتابیں لکھیں، جس میں اس نے اجتماعی اور

اقتصادی پہلوؤں پر خصوصی توجہ مبذول کی جو ظہور اسلام کے وقت جزیرہ عرب میں پیش آئے۔

۲۲- ڈیوڈ ایس مارگولیوث (David S Margoliouth) نے جو ایک متعصب انگریزی پادری تھا اور برطانیہ کی وزارت تعمیرات کا ایک تنخواہ دار ملازم تھا، اپنی کتاب میں یہ موقف پیش کیا ہے کہ آپ ایک سیاسی قائد (زعیم) تھے، جنہوں نے جزیرہ عرب کو ایک کرنے اور ایک عربی حکومت قائم کرنے کے لیے العیاذ باللہ دعوائے نبوت کیا، دوسرے لفظوں میں یہ متعصب پادری رسول اکرم ﷺ کو ایک عرب قومی ہیرو اور حکمران خاندان کا موسس قرار دیتا ہے، اس نے اپنا یہ نظریہ "محمدؐ و ظہور الاسلام" میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ (۱) وہ یہی رائے Encyclopaedia of Ethics میں اپنے مقالے "محمدؐ" میں پیش کرتا ہے، اس کا خیال ہے کہ محمد ﷺ کی اقتصادیات لوٹ مار اور مال غنیمت جمع کرنے پر مرکوز تھی۔

۲۳- اطالوی مولف لیون کائتانی (Leon Caetani) نے اسلامی تاریخ کے بعض پہلوؤں پر اپنی کتاب "حولیات الاسلام" میں نظر ڈالی ہے۔

اس نے اس کتاب میں اپنے معاونین کی مدد کے ساتھ، سیرت رسول ﷺ اور ظہور اسلام کے متعلق ضروری مواد جمع کر کے تاریخ کی مرکزی اور بنیادی مشکلات کو حل کرنے میں بڑی محنت کی ہے، اس عمل نے اس نوعیت کے تمام سابقہ کاموں کو دھندلا دیا، اس نے ہجری تاریخ ۱ھ/۶۲۲ء کی ترتیب سے ایسے حوادث کو جمع کر دیا ہے جن کا اسلام کی تاریخ سے تعلق تھا، اس نے مقدمہ (ج ۱/۳۲۲) میں جزیرہ عرب اور رسول اکرم ﷺ کی زندگی سے متعلق ہجرت سے پہلے کے مواد کو بھی یکجا کر دیا ہے، مولف ہر ہجری سال کے شروع میں دونوں تقویمات کے مابین موازنہ کرتے ہوئے ہر مہینے کو دوسرے کیلنڈر کے مہینے سے منطبق کرتا ہے، تیسرے حصہ میں مولف نے رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی اور اسلامی ریاست پر مواد جمع کیا ہے (فوک، ج د، ص ۳۱۱) مجموعی طور پر یہ ایک عمدہ کام ہے۔

مغربی علماء کا ایک گروہ ایسا ہے، جو اسلام کی سیاسی اور اقتصادی تشریح سے زیادہ نفسیاتی پہلو سے دیکھنے پر مصر ہے۔

اس گروہ کی قیادت ڈنمارک کی مستشرق بوہل (Fronz Bohle) اور سویڈش اسکالر تورا

اندرای (Tor Andrae) کرتے ہیں، ان دونوں نے آنحضور ﷺ کی سیرت کا دقیق نفسیاتی، عقلی اور فکری جائزہ لینے کی کوشش کی ہے، اس کے لیے انہوں نے متقدمین ماہرین کی تحریروں سے مدد لی ہے اور عہد قدیم کے مشہور پیغمبروں کا بھی نفسیاتی مطالعہ کیا ہے۔

۲۴-بوہل نے رسول اکرم ﷺ کی سیرت اور تاریخ ظہور اسلام کے متعلق کئی مقالات لکھے ہیں، یہ مقالات دائرہ معارف اسلامیہ (۱۹۰۸ تا ۱۹۳۹ء) میں طبع ہوئے ہیں لیکن مولف کو زیادہ شہرت رسول اکرم ﷺ کی سیرت کی کتاب سے ملی، بوہل کے خیال میں پیغمبر اسلام کو آخری لمحے تک اپنی نبوت و رسالت کا یقین تھا، بوہل کا رسول اکرم ﷺ کی رسالت کے متعلق مرکزی نقطہ یہی ہے، اس نے اقرار کیا کہ موضوعی مطالعہ سے محمد ﷺ کی طرف سے دھوکہ دینا بالکل ثابت نہیں بلکہ آپ کی تعلیمات سے پوری طرح یہ تاثر ملتا ہے کہ آپ کو اپنے اخلاص اور سچائی کا کامل یقین تھا۔ مولف قرآن کو محمد ﷺ سے منسوب کرتا ہے، جب کہ مدنی دور کی آیات کے متعلق بوہل کا خیال ہے کہ یہاں آکر آپ کی عادتیں اور اعصاب غیر عادی ہوگئے اور آپ خود اپنے ساتھ دھوکہ کرنے پر قادر ہوگئے اور مشکوک آیات کی صحت کا عقیدہ رکھنے لگے۔ (العیاذ باللہ)

بوہل کی نظر میں محمد ﷺ کی شخصیت بہت گہری ہے اور اس کو سمجھنا بے حد مشکل ہے، وہ یہ تو نہیں مانتا کہ محمد ﷺ پر صرع کے دورے پڑتے تھے لیکن دوسری طرف یہ بھی کہتا ہے کہ آپ کو معاذ اللہ ہسٹیریا کی قسم کا مرض تھا، اس کے ساتھ ہی وہ اعتراف کرتا ہے کہ آپ سیاسی ذہن رکھنے والے، اعلیٰ درجے کے ذکی اور عظیم عبقری تھے۔ (۱۲)

۲۵-تور اندرای (Tor Andrae) کی رائے بوہل کے مقابلے میں کچھ بہتر ہے، آنحضور ﷺ اور ظہور اسلام کے متعلق اس کی تحریریں بے شمار ہیں لیکن رسول اکرم ﷺ کی سیرت سے متعلق اس کی کتاب سب سے زیادہ اہم ہے، اس کتاب کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے، اس نے تحلیل نفسی کے اصول و قواعد کو سامنے رکھا ہے، وہ ابتداء میں کہتا ہے کہ یورپ کے ابتدائی سیرت نگار اس بات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے کہ کس طرح لاشعور اور تناقض ایک ہی عقل کے اندر جمع ہوجاتے ہیں۔ (۱۳)

اس کے نزدیک اس قسم کا شخص نفسیاتی طور پر ایک مرتبہ سچی وحی کا حامل ہوسکتا ہے اور

دوسری مرتبہ جھوٹی وحی کا، مگر اسے اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایسا دانستہ کر رہا ہے، چنانچہ محمد ﷺ کی استقامت اور دینی اصابت تصدیق کرتی ہے کہ آپ کی شخصیت دنیا کے ان عظیم لوگوں میں سے ایک ہے، جو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ زندگی کی تعبیر ہیں، اسی لیے ان کا زندگی (الحیاۃ المبدعۃ) سے وجدانی اتصال ہو جاتا ہے اور ان کا وحی ربانی سے بھی ربط ہوتا ہے۔ تورا ندرای کو یقین ہے کہ محمد ﷺ کی حقیقی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک یقینی صورت میں ایک جدید روحانی ترکیب پیش کی، جو ان عناصر پر مشتمل ہے، جو اس سے پہلے موجود تھے تاہم ان کے لیے ماضی سے مکمل طور پر انقطاع کرنا بھی ممکن ہو گیا۔

محمد ﷺ اپنی نبوت میں نہایت مخلص تھے، وہ دل سے یوم جزا کے مالک کے سامنے جھکتے رہتے تھے اور آپ نے نبوت کی دعوت کو خوف وخشیت کے ساتھ قبول کیا۔

بیسویں صدی میں یورپ کی سیرت نگاری میں اور وسعت پیدا ہوئی۔

۲۶-اس دور میں سب سے اہم کتاب فرانسیسی مستشرق الفونز اتنہ دینہ نے الجزائری مولف الحاج سلیمان بن ابراہیم (Alphonse Etienne Dinel el Sliman Ibrahim) کے ساتھ مل کر سیرۃ محمد رسول ﷺ کے نام سے تحریر کی، یہ کتاب پیرس سے ۱۹۲۰ء میں فرانسیسی اور انگریزی میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ان مسلمان سپاہیوں کے لیے بطور خراج عقیدت لکھی گئی جو پہلی جنگ عظیم یعنی ۱۹۱۴ سے ۱۹۱۸ء کے دوران شہید ہوئے تھے۔ اس کتاب میں ۳۵ رنگین تصویریں اور نقوش وغیرہ بھی ہیں۔ اس کے لیے سیرۃ ابن ہشام، طبقات ابن سعد اور سیرۃ حلبیہ پر اعتماد کیا گیا ہے۔ (۱۴) سیرت سے متعلق تمام حقائق کو جمع کرنے کی کوشش یورپ کے حملوں کا دفاع بھی کیا گیا، اسلوب بھی نیا ہے یعنی سیرت نگاری میں مکالمہ کے اسلوب کو اختیار کیا گیا۔

۲۷-ایک اور مولف جے، سی ارشیر (J.C. Archer) نے نئے اسلوب کو اختیار کیا اور نئے انداز سے سیرت میں ''عناصر صوفیہ فی حیاۃ محمدؐ'' کے عنوان سے کتاب لکھی، جو نیو ہیون امریکہ سے ۱۹۲۴ء میں چھپی، اس نے کتاب کے مقدمہ میں سپرنگر، بوہل اور اس طرح کے دوسرے مولفین پر سخت تنقید کی اور اس بات پر زور دیا کہ ایک رسول کی حیثیت سے آپ ﷺ کی زندگی میں سب سے اہم شے صوفیانہ مہارت ہے۔ اس کی کوشش یہ ثابت کرنے کی رہی کہ محمد ﷺ بطور صوفی

تجربات اور مہارت میں ہمارے علم وگمان سے کہیں برتر ہیں۔(۱۵)

۲۸-آرنلڈ ٹائن بی (Arnold Toynbly) نے فلسفہ تاریخ پر قلم اٹھایا اور رسول اکرم ﷺ کا ایک دینی قائد اور سیاسی حاکم کی حیثیت سے جائزہ لیا۔

اس نے لکھا کہ یہ بات تمام لوگوں کو معلوم ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے دو مرحلوں میں اپنی رسالت اور اپنے کاموں کی تکمیل کی، پہلا مرحلہ مکی اور دوسرا مدنی زندگی کا تھا۔ دونوں کی نوعیت الگ الگ ہے کیوں کہ اسلام کی تاریخ مدنی عہد میں نئے دور کے طور پر شروع ہوتی ہے۔ یہاں رسول اکرم ﷺ کی دینی دعوت کے ساتھ سیاسی ضرورت بھی شامل ہے، وجہ یہ ہے کہ اسلام میں دین اور ریاست (حکومت وامامت) دونوں لازم وملزوم ہیں، رسول اکرم ﷺ کی شخصیت میں دینی قائد اور سیاسی زعیم کے تمام عناصر کامل وتمام صورت میں موجود تھے لیکن سیاست کے ساتھ دین کا یہ آمیزۂ نبوی یورپ کے مسیحی مبلغین ومولفین کا ہدف طنز وطعن رہا، ان کا گمان ہے کہ رسول اکرم ﷺ مکی دور میں مخلص تھے لیکن مدنی دور میں آپ کا سیاسی غلبہ دینی اخلاص کی قیمت پر تھا، ٹائن بی رسول اکرم ﷺ کے سیاسی کارناموں کا اعتراف کرتا ہے، اس کا خیال ہے کہ محمد ﷺ کا سیاسی جذبہ تمدن کی تاریخ میں پہلے درجہ کے عامل کے طور پر قابل لحاظ اور قابل اعتبار ہے۔

وہ شدومد کے ساتھ اس رائے کو رد کرتا ہے کہ محمد ﷺ غیر صادق تھے۔(۱۶) مگر دوسرے مسیحیوں کی طرح وہ یہ کہنے سے باز نہ رہا کہ حضرت مسیح علیہ السلام برتر نبی ہیں رسول اکرم ﷺ کی مدینہ کی سیاسی زندگی کی وجہ سے نبوت کے اعلیٰ درجہ سے تنزل آ گیا۔

۲۹-فرانسیسی مستشرق بلیشر (Blachere) نے سیرت نگاری میں مآخذ ومصادر کی مشکلات پر گفتگو اور بحث کی ہے، "مشکلۂ محمدؐ" میں اس کا خیال ہے کہ سیرت طیبہ کے بیانات اور احادیث شریف میں متعدد روایات ایسی ہیں کہ جن کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور ان کی جگہ معتبر اور صحیح روایات پر سیرت نگاری کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

۳۰- اس رائے کو اسکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والے مستشرق ولیم مانٹگمری واٹ (William Montgomery Watt) نے بہت پسند کیا اس نے سیرت کے موضوع پر کئی کتابیں تحریر کی ہیں، محمدؐ فی مکہ (Muhammad at Macca) (۱۹۵۳ء) محمدؐ فی المدینۃ (Muhammad at

(Muhammad Prophet and Statsman) محمدؐ النبی و رجل الدولہ (۱۹۵۶ء)، (Madina)

(۱۹۷۱ء)۔ ان کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اسلام اور اس کے ظہور کے متعلق جدید انتقادی اصولوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

محمدؐ فی مکہ بنیادی طور پر مورخین کے لیے لکھی گئی۔ (۱۷) اس میں ان اجتماعی معاشرتی اور اقتصادی معاملات کی وضاحت کی گئی، جو آپؐ کے زمانے میں مکہ مکرمہ میں رائج تھے۔ مصنف کے خیال میں ابن ہشام نے اپنی کتاب میں جو اشعار نقل کیے ہیں، ان میں سے کچھ ہی صحیح ہیں، اس کتاب میں درج بہت سے نکات تحقیق اور غور وفکر کے محتاج ہیں۔

۳۱- دوسری کتاب محمدؐ فی المدینۃ بھی ٹھیک اسی انداز کی ہے، یہ دونوں کتابیں متعدد مقالات کا مجموعہ ہیں اور ہر مقالہ ایک مستقل موضوع اور فکر کا حامل ہے، مولف نے بنیادی عربی مآخذ سے استفادہ کیا ہے، اس کی تحلیلی گہرائی اور واقعات کو باہم ملانے کی اہلیت کتاب میں یکساں طور پر نظر آتی ہے۔

مولف نے مغربی مولفین کی طرف سے ہونے والے حملوں کا کامیابی سے دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب کوئی شخص محمد ﷺ اور اسلام کے بارے میں تاریخی طور پر غور وفکر کرتا ہے تو آپؐ کے کارناموں کی عظمت کی بنا پر اس کی حیرانی افزوں ہو جاتی ہے۔

۳۲- ان دونوں کتابوں کا اختصار محمدؐ النبی و رجل الدولۃ میں پیش کیا گیا ہے، اس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہ میری دونوں کتابوں محمد فی مکہ، محمد فی المدینۃ کی تلخیص ہے۔ جب ہم غیر ضروری تفصیلات حذف کردیں تو ہم یہاں بڑی باریک بینی کے ساتھ ایک زمانی نظام کی پیروی کرتے ہیں، تبدیلی قوانین کا یہ عمل سیرت کے مطالعہ میں سازگار ثابت ہو سکتا ہے۔ (۱۸)

مصنف نے دوران بحث جابجا رسول اکرم ﷺ کی رسالت، آپ کے اخلاص اور آپ کی سچائی کا اعتراف کیا ہے۔ (۱۹)

اگرچہ کسی یورپین کے لیے رسول اکرم ﷺ کی ذات کے ساتھ انصاف کرنا ممکن نہیں کہ اس کے اور مسلمانوں کے نظریات میں زمین آسمان کا فرق ہے تاہم واٹ کے بعض خیالات سے عدم اتفاق کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ اس نے آپؐ کی ذات اور سیرت کے ساتھ انصاف کی کوشش کی ہے۔

حرف اختتام: موجودہ عہد میں مغرب میں بھی سیرت نگاری کا انداز اور اسلوب بدل چکا ہے، جس کی وجہ عالمی تغیرات وضرورتیں ہیں، خصوصاً ''شرق اوسط'' کے ممالک سے تجارتی روابط بڑھانے کے لیے مسلمان ملکوں سے دوستی یورپ کی اقتصادی اور سیاسی مجبوری ہے، اس وقت بہت سے مسلمان علماء مغربی جامعات میں اہم ترین عہدوں پر کام کررہے ہیں، مغربی ملکوں میں بسنے والی مسلمان اقلیت کو نظر انداز کرنا بھی مشکل ہے۔ ان باتوں نے ''سیرت نگاری'' کے ماحول کو اگرچہ کچھ تبدیل ضرور کیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قرون وسطیٰ اور صلیبی جنگوں کے دوران پھیلنے والا تعصب آج بھی موجود ہے جس کی مثالیں ناروے اور ڈنمارک وغیرہ کے اسلام دشمن اور خبث باطن رکھنے والے بعض صحافیوں اور اہل قلم کی دلآزار تحریروں اور حرکتوں سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان ملکوں میں سیرت پر تحقیق کے ایسے مراکز قائم کیے جائیں، جہاں مغرب سے آنے والی ہر تحریر کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے اور اس کے متعلق صحیح اور درست موقف سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ (۲۰)

حواشی

(۱) Sanders، کتاب مذکور، ص ۱۷۔ (۲) حوالہ مذکور۔ (۳) Hurgronje، ص ۴۴۔ (۴) Jellery Artheer، ص ۳۳۳۔ (۵) میور الجد رالاسلامی از نبرا کالاک ۱۸۹۷، ص ۱۰۳۔ (۶) Sanders، ص ۱۸۔ (۷) Hitti,P.K.، ص ۵۷-۵۸۔ (۸) مقالہ سیرت در Encyclopaedia of Islam Levi Della vi le، ص ۴۴۔ (۹) The Material used by the Historians of the Middle East:Watt.M، ۱۹۴۲، ص ۲۳۔ (۱۰) Islam and Syria of Henry Lammens in the writhings: Sabibi KS اور در Historians of the Middle East، در مطبوعہ ۱۹۶۲ء، ص ۲۳۲۔ (۱۱) Muhammad and The rise of Islam Heroes of the nation GP Pulnums Sons: Morgoliouth D.V (۱۹۰۵ء، ص vi، vii)۔ (۱۲) Baahl, Frans: حیاۃ محمدؐ ''العالم الاسلامی'' العدد ۲۱، کانون ثانی ۱۹۳۱ء، ص ۹۵۔ (۱۳) Sanders، ص ۲۱۔ (۱۴) حیاۃ محمدؐ رسول اللہ، مطبوعہ پیرس ۱۹۱۸ء، ص ۱۱۷۔ (۱۵) ارشیر نیوہیون، مطبوعہ جامعہ ییل، ۱۹۳۴ء، ص ۵۔ (۱۶) Muhammad at Macca، ج ۳، ۴۶۶-۴۹۸۔ (۱۷) واٹ، آکسفرڈ، مطبوعہ لائیڈن ۱۹۵۳ء، ص ۶۔ (۱۸) مطبوعہ ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۷۔ (۱۹) ایضاً، ص ۴۴۔ (۲۰) ڈاکٹر محمد حمادہ حمادہ کی کتاب سے راقم الحروف نے یہ تلخیص اپنے سفر مدینہ (۲۵ جون تا ۸ جولائی ۲۰۰۸ء کے دوران مسجد نبوی کی لائبریری میں بیٹھ کر تیار کی۔

سعدی ہندوستان - سید امیر حسن علا سجزیؒ

پروفیسر مسعود انور علوی

حضرات مشائخ چشتؒ میں جو خصوصی مقبولیت و محبوبیت اور امتیازی شان اللہ تعالیٰ نے سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کو ارزانی فرمائی تھی وہ دوسرے مشائخ میں کم نظر آتی ہے۔ اس ماہ تمام کے گرد باکمال حضرات کی ایسی کہکشاں تھی جس کی نظیر ہندوستانی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ ان جاں نثار عبقری شخصیات میں امیر خسرو اور حسن دہلوی سر فہرست ہیں۔

نام: امیر سید نجم الدین حسن علا سجزی ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء میں بدایوں (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام علاء الدین تھا۔ جو اصلاً سیستان کے رہنے والے تھے۔ بعض تذکروں اور شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علاء الدین سیستانی معروف بہ علائی سجزی سے مشہور ہوئے۔ (۱)

لیکن بچپن ہی میں وہ اپنے والدین کے ہمراہ دہلی چلے گئے اور پھر مستقل طور پر وہیں قیام کیا تعلیم و تربیت اور پرورش و پرداخت بھی وہیں ہوئی۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ ان کے والد ملازمت کے دوران بدایوں میں رہے ہوں گے اس کے بعد دہلی منتقل ہو گئے ہوں گے۔

اس کی شہادت امیر حسن کے کلام میں ملتی ہے:

پروردہ فضل ایزدش ارشاد غیبی مرشدش

بودہ بدایوں مولدش ، دہلی است منشا داشتہ (۲)

(وہ فضل ایزدی کا پروردہ، ارشاد غیبی اس کا پیر و رہبر، بدایوں اس کی جائے پیدائش اور دہلی اس کا مسکن ہے)

حسن دہلوی کا شجرہ نسب سادات کے گھرانے سے تھا۔

قرشی الاصل ہاشمی نسبم کز ہوالیش برآمد ایں شجرم

صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ان کا دور اپنی مردم خیزی، علم پروری، سخن شناسی اور ادب نوازی میں بہت مشہور تھا۔ مولانا ضیاء الدین برنی نے اپنی مشہور زمانہ تاریخ میں لکھا ہے:

''اس عصر کو خیر الاعصار کہیں تو کچھ بیجا نہیں کیوں کہ وہ بڑے بڑے معتبر سادات، مشہور علماء اور ذی ہمت امراء کی ذات بابرکات سے مزین تھا۔ سادات میں قطب الدین شیخ الاسلام شہر (جد بزرگوار قاضیان بدایونی) سید منتجب الدین وسید جلال الدین پسر سید مبارک وسید عزیز وسید معین الدین سامانہ وسادات کردیز وسادات عظام کیتھل وسادات جنجر وسادات بیانہ وسادات بدایوں وغیرہ صحت نسب اور بزرگی حسب میں عدیم المثال تھے۔ طبقۂ علماء اور صوفیہ میں مولانا برہان الدین بلخ مولانا برہان الدین بزاز، مولانا نجم الدین دمشقی شاگرد مولانا فخر الدین رازی، مولانا سراج الدین سجزی، مولانا شرف الدین دیوانجی، صدر جہاں منہاج الدین جرجانی، قاضی رفیع الدین گاذرونی، قاضی شمس الدین مزاحی وقاضی رکن الدین سامانہ جیسے بزرگ شریک تھے''۔ (۳)

تعلیم: ان کے خاندانی اور نجی حالات کی طرح تعلیم وتربیت کی تفصیلات نہیں ملتی ہیں مگر چوں کہ وہ پورا دور علمی وادبی حیثیت سے مشہور تھا اس لیے یقیناً وہ بھی تمام عقلی ونقلی علوم سے آراستہ کیے گئے ہوں گے نیز ان کی نظم ونثر بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ بلکہ برنی کی روایت اس سلسلہ میں بہت اہم ہے کہ ان کو دہلی کے اکابر علماء وفضلاء اور سلاطین کے حالات سے بھی بڑی باخبری تھی۔ وودر تمامی عصر علائی سید مجد الدین پانی پتی وسید حسن وسید مبارک کہ ہر یکے از ایشاں علامہ بود در افادہ مشغول بودند۔ (۴)

تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ/۶۸۵ھ) کے عہد حکومت کے بڑے بڑے شاعروں وادیبوں اور ارباب دانش سے ان کے مراسم تھے جنھوں نے ان کی شخصیت میں مزید جلا پیدا کی۔

اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے شاہی لشکر میں ملازمت کی جہاں ان کا رشتہ قلم وکاغذ سے رہا۔ شہزادہ محمد سلطان کے ہمراہ امیر خسرو اور ان کے دوست امیر حسن نے ۶۷۸ھ

میں ملتان کا سفر کیا اور وہاں تقریباً ۵ سال قیام کیا۔ شہزادہ کی بزم علماء وفضلاء اور ہنر مندوں سے آراستہ تھی۔ مجلس میں شاہنامہ فردوسی، دیوان حکیم سنائی، خاقانی اور مولانا نظامی گنجوی کو پڑھا جاتا اور مباحثے ہوتے تھے۔ شہزادہ خود بیحد ذہین، سخنور وسخن شناس تھا۔ امیر خسرو کا بیان ہے کہ انہوں نے وقت نظر، سخن فہمی، ذوق صحیح اور متقدمین ومتاخرین کے اشعار کو حافظہ میں محفوظ رکھنے والا دوسرا نہ دیکھا۔ اس نے ایک قلمی بیاض بھی تیار کی تھی جس میں تمام نامور شعراء کے بیس ہزار منتخب اشعار جمع کیے تھے۔ امیر خسرو وامیر حسن اس خوبی انتخاب کے قائل اور شہزادہ کی نکتہ رسی وسخن فہمی کے مداح تھے۔ (۵)

ملتان کے دوران قیام حضرت حسن نے اپنا فارسی دیوان مکمل کیا تھا جس میں ان کی ۱۲ برس سے ۳۰ برس کی عمر تک کا کلام تھا مگر وہ دیوان اب ناپید ہے۔ علاءالدین خلجی وجلال الدین خلجی کے درباروں سے حسنؒ کا تعلق برابر رہا بلکہ فوائد الفواد میں اس کی داخلی شہادتیں متعدد مقامات پر ملتی ہیں۔

سلطان المشائخ کی بارگاہ میں رسائی اور مقبولیت: ۷۰۷ھ میں حضرت محبوب الہیؒ (۶۳۳ھ-۷۲۵ھ) کے دامن سے وابستگی نے امیر حسنؒ کی زندگی میں ایک بڑا انقلاب برپا کردیا۔ اس سلسلہ میں دو روایتیں بلکہ حکایتیں بھی بعض مورخین نے بیان کی ہیں لیکن وہ بعض شواہد کی بنا پر محل نظر ہیں۔ بہر حال حضرت سلطان المشائخ جیسے عارف وبزرگ صوفی کی نگاہ کرم نے ان کے دل کی دنیا بدل دی۔ شیخ سے بیعت اور ان کی بارگاہ میں خصوصی تقرب اور محبت نے امیر حسن کو پیر ومرشد کے ملفوظات (فوائد الفواد) جمع کرنے پر آمادہ کیا اور تقریباً ۱۵ سال پابندی کے ساتھ انہوں نے اس اہم وبابرکت کام کو انجام دیا۔ انہوں نے اپنے دیوان میں جابجا اپنے شیخ سے عقیدت ومحبت کا اظہار کیا اور ان کی حلقہ بگوشی اور غلامی پر ناز کیا ہے کہ ہم اپنے پیر کے آستانہ کے کتے ہیں۔ دنیاوی شیر بھی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، حسن آپ کے در کا کتا ہے اس کو اسی پر پڑا رہنے دیجیے۔ حسن جب آپ جیسی شخصیت کے در کا کتا بن گیا تو فلک نے اس سے کہا کہ ہم بھی تمہی میں سے ہیں۔

شیر گردوں بگرد ما نہ رسد   ما سگ آستانہ پیریم
بیچارہ حسن سگ درِ تست   چہ چارہ کہ از درش برانی

حسن چوں از سگان درگہت شد فلک گفتش کہ ماہم از شمائیم
تو شاہ و ما اسیر کمند غلامئیم بریاد نام نیک تو در نیک نامئیم
گفتیم پنج بیت بیادت دو پنج گنج ما خود حسن نہ ایم غلام نظامئیم
مانند تو نیست در ہمہ شہر تو صورت رحمت خدائی

یعنی آپ بادشاہ، میں آپ کی غلامی میں گرفتار اور آپ ہی کے نام سے نیک نام ہوں۔ آپ کی شان میں پانچ شعر نہیں دو پنج گنج کہے۔ میں حسن نہیں ہوں بلکہ نظام الدین اولیاء کا غلام ہوں۔ آپ جیسا تو پورے شہر میں کوئی نہیں آپ رحمت خداوندی ہیں۔

شیخ ما چوں محمد آمد نام حسن اندر ثنائے او حسان

چونکہ ہمارے پیرومرشد کا نام نامی بھی محمد (نظام الدین محمد) ہے اس لیے حسن ان کی تعریف وتوصیف میں حضرت حسان بن ثابتؓ کی طرح رطب اللسان ہے

صاحب نفائس المآثر میر علاء الدولہ قزوینی نے ان کے سلسلہ ارادت ونسبت محبوب الٰہی کو بکثرت اشعار میں پیش کیا ہے

آنکہ او را فیض خاطر از نظام اولیاست چوں حسن در ملک معنی خسرو بحر و براست
شد نظام الاولیاء را فتح از شیخ فرید آں شکر گنجے کہ سوئے گنج معنی رہبر است (۶)

چوں کہ ان کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے فیض پہنچا ہے اس لیے حسن کی طرح ملک معنی میں بحروبر کے بادشاہ ہیں جس طرح حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو حضرت فریدالدین گنج شکر سے فیض باطنی حاصل ہے وہ گنج شکر جو معانی کے خزانے کے رہبر ہیں ان کے دیوان اور فوائد الفواد کی متعدد مجالس کے بیان میں ان کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی صوفیانہ زندگی اور سلطان المشائخ کی عنایت بے غایت کا ذکر ان کے معاصرین نے بھی کیا ہے۔ سیر الاولیاء کے مصنف امیر خورد کرمانی نے ان کو حضرت سلطان المشائخ کے ''یاران اعلیٰ'' میں شمار کیا ہے۔ وہ اپنے شیخ سے مکمل طور پر فیض یاب اور چوگوشیہ ٹوپی وخرقہ خلافت کے بھی حامل تھے مگر بہ پاس ادب اور شاید اپنی مخصوص فطری طبیعت کی بناپر انہوں نے کبھی کسی کو بیعت نہ کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہوگی کہ حضرت محبوب الٰہی نے ان کو اور ان کے محبوب دوست امیر خسرو کو

تحریری خلافت نامہ نہ عطا فرمایا۔ حضرات صوفیہ کے یہاں تحریری خلافت کی بہت اہمیت و ضرورت بلکہ ناگزیری ہے۔ شہزادہ دارا شکوہ نے بھی لکھا ہے کہ حضرت محبوب الٰہی کے مریدین بہت ہیں مگر ان میں چار بہت فاضل و کامل اور مشہور و معروف ہیں۔ امیر خسرو، شیخ نصیر الدین چراغ دہلی، شیخ برہان الدین غریب اور شیخ حسن دہلوی۔ (۷)

حضرت برہان الدین غریبؒ سے امیر حسن کو خصوصی تعلق و محبت اور عقیدت تھی دیوگیر کے مستقل قیام سے ۱۹ سال قبل جب انہوں نے ایک مثنوی لکھی تو اس میں بھی حضرت غریبؒ کے لیے سر حلقہ سیر الٰہی، صفائے اہل بینش، برہان دین، شمع سرائے آفرینش، شمع اسلام، جیسے الفاظ کا نہایت احترام و عقیدت سے استعمال کیا ہے۔ امیر خسرو اور حسن دہلوی دونوں ہمیشہ بادشاہان وقت کے درباروں سے وابستہ رہے اور حضرت محبوب الٰہی نے ان کو اس سے منع نہ فرمایا۔ ایک عرصہ تک ان کا قیام دہلی رہا پھر محمد تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) کے حکم پر پایۂ تخت کی تبدیلی کے وقت وہ دیوگیر (دولت آباد دکن) آگئے اور پھر مدت العمر یہیں رہے بالآخر ۲۹/صفر جمعہ ۷۳۸ھ/ ۱۳۳۷ء) میں وفات پائی اور اسی زمین (خلد آباد مہاراشٹر) میں آسودۂ خواب ہوئے۔

انہوں نے دولت آباد کی سرزمین کی تعریف میں ایک مثنوی بھی (تیرہ اشعار) کہی تھی:

زہے خرم بنائے دولت آباد	کہ ہم بر پائے دولت یافت بنیاد
فلک کردار عالی بارگاہے	ستارہ کیست اینجا بار خواہے
مروح منظرے فرخ مقامے	در استحکام و زیبائی تمامے
عطارد دید سقفے آسمان گیر	چہ گفتہ کاش اینجا بودے تیر
بگونہ گونہ نقش روح پرورد	ہمیشہ با ارم قلب دزم کرد
سعادت ہاست دروے رخ نہادہ	جہاں بروے در دولت کشادہ
چو ایوان قمر از روشنائی	چو دوران فلک در دیر پائی
ظرافت بخش اوقات قرینان	مقام ہمدمان وہم نشینان
ہمہ نورست از نزدیک واز دور	حضور دوستاں نور علی نور
چہ خوشتر زانچہ اینجا خوش نشینم	زمانے روئے دیگر بہ بینم

حضور دوستاں فتح مبین است　　سر جملہ غنیمت ہا ہمین است
خدا وندا زمین ایں مکاں را　　بدہ قدرے کہ دادی آسماں را
مبارک فال کن بر یار و بر دوست　　خصوصاً بر کسے کو بانی اوست

(یعنی دولت آباد کی بنیاد کیسی مبارک واچھی ہے کہ دولت کے پاؤں پر اس کی نیو رکھی گئی۔ دولت آباد آسمان جیسی اور بلند و بالا بارگاہ والی ہے، کون ستارہ ہے جو یہاں باریاب ہو۔ یہاں کا منظر بڑا ہوادار، پرکیف و فرحت بخش ہے دولت آباد استحکام وخوبصورتی میں مکمل ہے۔ دبیر فلک (دوسرے آسمان کا ستارہ) نے جب اس کی چھت جو آسمان سے باتیں کررہی ہے دیکھی تو (حسرت سے) کہا کاش میں اس چھت کا ایک شہتیر ہوتا۔ طرح طرح سے روح کو بالیدگی بخشنے والا نقش۔ جنت میں ہونے کے باوجود ہر وقت یہ خیال ہوتا کہ کاش یہ وہاں ہوتا۔ یہاں ہر قسم کی سعادتیں رونما رہتی ہیں۔ سارے جہان نے اس پر دولت و ثروت کا دروازہ کھول رکھا ہے چاندنی رات کی طرح روشن اور اپنی پائداری میں فلک کی گردش کی طرح ہے۔ رہنے والوں کو ظرافت وتازگی بخشنے والا اور ہمدموں و دوستوں کی آماج گاہ ہے۔ دولت آباد دور و نزدیک سے سرتاپا نور اور دوستوں واحباب کی موجودگی نور علی نور ہے۔ اس سے بہتر کیا ہے کہ ہم یہاں چین اور خوش دلی سے بیٹھ کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں۔ دوستوں کی موجودگی فتح مبین اور تمام غنیمتوں کا راز ہے۔ اے اللہ اس مقام کی سرزمین کو آسمان کی منزلت عطا فرما۔ اس کو یاروں و دوستوں اور خاص کر اس کے بانی کے لیے مبارک بنا)۔

علمی وادبی یادگاریں: امیر حسن سجزی کی اس وقت تین چیزیں یادگار ہیں۔ ۱- فوائد الفواد جو حضرت سلطان المشائخ کا مستند واہم ملفوظ ہے۔ اس کو انہوں نے ۳۲ مجالس میں مرتب کیا۔ پہلی مجلس ۳ شعبان المعظم ۷۰۷ھ یکشنبہ کو قلم بند کی اور آخری مجلس کا اختتام ۱۱ شعبان المعظم ۷۲۲ھ دوشنبہ کو ہوا۔ فوائد الفواد کی حیثیت نہ صرف تصوف کے دستور العمل کی ہے بلکہ اس میں امور شریعت، اسرار طریقت وحقیقت، متعدد صوفیہ کے احوال واقوال، حضرت محبوب الٰہی کی جامع و دلفریب شخصیت، ان کا طریقہ تبلیغ وارشاد وتلقین اور اس دور کے کوائف کے مستند و جامع تذکرہ کے ساتھ ہی جامع ملفوظ کے بعض حالات و واردات اور کیفیات کا بھی بیان ہے۔ فوائد الفواد

فارسی انشاء پردازی کا بھی اعلیٰ نمونہ ہے۔ جامع ملفوظ نے بیشتر عبارتیں حضرت شیخ کی زبان میں ہی درج کی ہیں جن سے اس ملفوظ کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے اور یہ مقبول مشائخ روزگار اور مرہم سینۂ عشاقِ دلفگار ہو گیا۔

فوائد الفواد کی قدر و منزلت اور اس کی اہمیت و مقبولیت کی بنا پر امیر خسرو جیسی عبقری اور حضرت سلطان المشائخ کے قلب و نگاہ میں اہم ترین اور محبوب شخصیت بھی رشک سے یہ کہا کرتی کاش میری تمام کتابیں اور سارا علمی و ادبی سرمایہ جس کو تمام عمر جمع کیا وہ بھائی امیر حسن کا ہوتا اور ان کے جمع کیے سلطان المشائخ کے ملفوظات میرے ہوتے تاکہ میں دنیا و آخرت میں اس پر فخر کر سکتا۔

''کاشکے تمامی کتب کہ درآں عمر صرف کردہ ام برادر امیر حسن رابودے و ملفوظات سلطان المشائخ کہ جمع کردہ اوست مرابودے تا من بداں در دنیا و آخرت فخر و مباہات کردے الخ''۔(۸)

فوائد الفواد کے اردو تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ چند سال قبل محترم حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی نے ان کا بہت عمدہ و سلیس اردو ترجمہ کر کے دیدہ زیب شائع فرمایا ہے۔

امیر خورد کرمانی اور مولانا ضیاء الدین برنی نے ان کی لیاقت و قابلیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

> ''ان کی نظم و نثر صحت ترکیب اور روانی سخن میں بے مثل ہے۔ ان کی غزلیں وجدانی ہیں وہ سعدی ہندوستان ہیں ان کی جگر سوز غزلیں عاشقوں کے دلوں کے چقماق سے محبت کی آگ نکالتی ہیں اور ان کے دل پذیر اشعار سے سخنوروں کے دل راحت پاتے ہیں اور ان کے روح افزا لطائف سے اہل ذوق لطف اٹھاتے ہیں۔ ان کے کلام میں سعدی کے کلام کی چاشنی پائی جاتی ہے''۔(۹)

دولت شاہ سمرقندی نے نویں صدی ہجری کے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ حسن کا دیوان اس زمانہ میں بہت ہر دل عزیز و مکرم ہے۔ سخن شناسوں کو ان کے کلام سے حسن اعتقاد اور بیحد التفات ہے چوں کہ ان کا کلام عوام و خواص میں بہت مقبول و مشہور ہے اس لیے صرف ایک غزل لکھی جاتی ہے۔

دیوان خواجہ حسن دریں روزگار عزیز و مکرم است و صاحب نظراں و مستعداں بہ سخن خواجہ حسن اعتقادے والتفاتے زیادہ از تصور دارند و چوں بین الخواص والعوام او شہرتے عظیم دارد زیادہ

از غزلے دریں جا ثبت نہ شد۔(۱۰)

دولت شاہ نے یہ غزل درج کی اور لکھا کہ اکثر فضلاء نے اس کا جواب لکھا ہے مگر کسی کی غزل اس غزل تک نہ پہنچی۔

ساقیا مے دہ کہ ابرے خاست از خاور سپید سرو را سر سبز شد صد برگ را چادر سپید

(ساقی! شراب دے کہ مشرق سے خاص نوعیت کی گھٹا اٹھی ہے جس نے سرو کو شاداب اور پتوں کو ہرا بھرا کردیا ہے)۔

مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؒ (م ۸۹۸ھ) نے فارسی کے جن دو ہندوستانی شعراء کا تذکرہ بہارستان میں کیا ہے وہ یہی دو دوست ہیں۔ امیر خسرو، امیر حسن سجزی۔ حسن سجزی کے متعلق ان کی رائے بہت وقیع ہے:

"وے را در طریق غزل خاص است اکثر قافیہ ہائے تنگ و ردیف ہائے غریب و بحر ہائے خوش آیند کہ اصل در شعر خاصہ در غزل ملاحظہ آنہا ست اختیار کردہ ولا جرم از آنہا شعر وے را حالتے حاصل آمدہ است کہ اگر بحسب بادی نظر آساں نماید امادر گفتن دشوار است ولہذا اشعار وے را سہل ممتنع گفتہ اند"۔(۱۱)

یعنی انہوں نے غزل گوئی میں ایک مخصوص انداز اختیار کیا تھا اکثر تنگ و مشکل قافیوں، غیر معمولی ردیف و عمدہ بحروں میں اشعار کہتے تھے جس سے ان کی شاعری میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی اگر چہ ان کا کلام بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے مگر ایسا کلام کہنا سخت مشکل ہوتا ہے اسی بنا پر ان کے اشعار سہل ممتنع کہے جاتے ہیں۔

ان کے بعد کے بہت سے شعراء نے ان سے فیض یاب ہوکر اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اکبر کے ملک الشعراء فیضی ان کو اپنا پیر معنوی گردانتے تھے۔ امیر حسن آنے دارد کہ عاشق آں تواند شد اگر چہ امیر خسرو یوسف زماں بود

دگر از علم من سخن طلبی بر زبانم جہاں جہاں سخن است

و اگر از پیر من نظر جوئی روح فیاض خسرو و حسن است (۱۲)

یعنی امیر حسن کی تو ایسی ادا ہے کہ اس پر عاشق ہو جائے حالانکہ امیر خسرو حسین دوراں تھے۔

تم اگر میرے علم کے سلسلہ میں جاننا چاہتے ہو تو میرا علم بہت وسیع ہے ہر جگہ اس کا چرچا ہے لیکن اگر میرے پیر (رہنما) کو تلاش کر رہے ہو تو وہ ان ہی دو بزرگوں خسرو و حسن کی ارواح کا فیض ہے۔

ہلالی نے بھی بجا طور پر اس کا اعتراف کیا ہے ؎

ہلالی از کمال شعر دارد منصب شاہی   کہ سوز خسرو ست و ناز کیہائے حسن با او (۱۳)

(ہلالی شاعری کا بادشاہ ہے جس کے کلام میں خسرو کا سوز اور حسن کی نازک خیال ہے)۔

حضرت حسن سجزی نے اپنی خصوصیات اور جدت طرازیوں کا بیان جا بجا کیا ہے۔

بر نظم حسن دیدم شہرے شدہ دیوانہ   زیرا کہ نمی یابند ایں طرز بہ دیوانہا

(حسن کی شاعری پر تو ایک عالم دیوانہ ہے اس لیے کہ دواوین میں یہ طرز نہیں ملتا ہے)۔

ایں طرز شیوہ حسن است ورنہ پیش ازیں   چندیں شکر بعرصہ ہندوستاں نبود

(حسن کا یہ نیا انداز ہے اس سے پہلے ہندوستان میں ایسی شیریں بیانی کا وجود نہ تھا)۔

زیں شعر حسن بشنو حال دل مسکیناں   صد درد نہاں دارد ہر بیت کہ میخوانم

(حسن کی شاعری سے مسکینوں کے حال دل کی ترجمانی سنو جو شعر پڑھتا ہوں اس میں سیکڑوں درد پوشیدہ ہیں)۔

ہند وے چرخ زہر داد مرا   ہمہ ہندوستاں پر از شکرم

(ظالم آسمان نے مجھے زہر دیا مگر پورا ہندوستان میری شیرینی سخن سے پُر ہے)۔

اے حسن بر آستین نظم خود نوکن طراز   خاصہ ایں ساعت کہ طرز خاص پیدا کردۂ

(حسن! شاعری میں خاص انداز پیدا کرو بالخصوص جب تم نے ایک نیا طرز ایجاد ہی کر لیا ہے)۔

آں بلبلم کہ شہر پر آوازۂ منست   کز اوج کنگرِ فلک آواز میکنم

(میں وہ بلبل ہوں کہ سارا شہر میرے نغموں سے گونج رہا ہے کیوں کہ میں آسمان کی بلندیوں سے گویا ہوں)۔

مست سماع قول من اند اہل ایں دیار   اینک ہماں طریق غزل سازی می کنم

(یہاں کے سبھی لوگ میرے شعروں سے مست ہیں یہی وہ طرز ہے جس میں میں غزل گو ہوں)۔

ان کی غزلوں میں سوز و گداز، جذبات کی شدت، زبان کی شیرینی، لطافت، روانی،

صفائی بیان، بندش وتراکیب کی چستی وقادرالکلامی بہت ہے۔ ان کی زندگی میں ہی ان کا کلام اس قدر مقبول ومشہور ہوگیا تھا کہ حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ محفل سماع میں حالت ذوق وشوق میں فرمائش فرماکر ان کی غزلیں سنتے اور حاضرین کو عجیب وغریب کیفیات کا ادراک ہوتا تھا۔

ان کا دیوان جو موجود اور ہندوستان میں مروج ہے اس میں آٹھ سو سے زائد غزلیں اور قصائد ورباعیات اور تقریباً ۳۰ بہت مختصر وطویل مثنویاں بھی ہیں۔ حضرت محبوب الٰہی کی مدح میں بھی ان کی ایک مثنوی ہے جس سے ان کی بے پناہ عقیدت ومحبت کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں ایسی غزلیں بہت ہی کم ہیں جو متقدمین یا معاصرین شعراء کے تتبع میں ان ہی کے بحور وقوافی میں کہی گئی ہوں۔ امیر خسرو نے کہا ہے:

خسروا! شعر تو اسرار حدیث ست مگر کز سخنہائے تو ام بوئے حسنؔ می آید

(خسرو تمہارے شعر اسرار حدیث تو ہیں مگر تمہاری باتوں سے مجھے حسن کی خوشبو آتی ہے)۔

یہ دیوان مہاراجہ سرکشن پرشاد، شاد کی سرپرستی میں مسعود علی صاحب محوی نے ۱۳۵۲ھ میں طبع کرایا تھا۔ دیوان دوم میں ان کا ۳۳ سال کا کلام، یہ انہوں نے سلطان علاءالدین خلجی کے عہد حکومت میں ۷۱۴ھ میں مرتب کیا تھا۔ ہندوستان وغیر ممالک کے کتب خانوں میں اس دیوان کے قلمی نسخے موجود ہیں۔

ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی صاحب نے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے جو کام پروفیسر نورالحسن صاحب ہاشمی کی نگرانی میں ''حضرت حسن سجزی حیات وشاعری'' پر کیا تھا اس میں ان امور کی نشان دہی کی ہے۔ ۱۹۷۹ء میں یہ کام لکھنؤ سے طبع ہوچکا ہے لیکن اس پر بھی مزید اضافوں کی گنجائش ہے۔ کار دنیا کسے تمام نہ کرد۔

ان کے دیوان میں تصوف اور راہ سلوک کے مقامات، خودشناسی وخداشناسی، نفس امارہ سے مکمل رہائی، خودی سے نجات، اس کے ضمن میں فتوحات باطنی، نایافت کا اظہار، فقر ودرویشی، قناعت، سلوک میں استقامت، خلوت در انجمن وانجمن در خلوت، عشق ومحبت، تضرع وانابت، ہجر وفراق، صبر وتسلیم ورضا، اخلاص ونیازمندی کے بیان میں بکثرت اشعار ملتے ہیں۔ ان سے ان کے مشرب ومسلک اور حال وکیفیت کا بہت کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسرے حضرات صوفیہ کی طرح ان کے کلام میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں عشق کو غیر معمولی اہمیت نہ دی گئی ہو۔ کیوں کہ وہ انسانی فطرت کا خاصہ، حضرت حق کا بے بہا عطیہ اور عنایت ہے۔ اس کے ذریعہ انسان اپنے وجود کا راز پالیتا ہے اس کے بغیر باطنی کمالات کی تکمیل ممکن نہیں ہوتی۔ انہوں نے اپنے اہم و مختصر رسالہ مخ المعانی میں اس سلسلہ میں بڑی عمدہ گفتگو فرمائی۔ یہ رسالہ حضرت محبوب الٰہی بہت پسند فرماتے ہیں کہ اگر تم بقائے جاودانی چاہتے ہو تو عشق کی تلوار کو گلے لگالو۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی طرح انہوں نے بھی جا بجا عشق کو عقل پر فوقیت دی ہے اور اس سے رستگاری پر زور ڈالا ہے۔

بہ تیغ عشق شو کشتہ حسن وار　　اگر خواہی بقائے جاودانی
برو اے عقل، ما دانیم و عشقش　　تو با ایں کارہا کارے نہ داری
برو اے مدعی عمرت حرامست　　کہ دل داری و دل دارے نہ داری

انہوں نے غم یار کو ہی زندگی کا مقصد اور بڑی دولت بتایا ہے کہ غم یار میرا ایمان، عشق و سرمستی مذہب و مشرب ہے وہ اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ اس کیفیت میں مزید ارزانی کرے۔

مرا ایماں غم یارست و مذہب عشق و دیں مستی　　خداوندا مزیدی دہ بایمانے کہ من دارم

عشق جیسی بے بہا دولت جسے مل جائے وہ دنیا و آخرت سے بیگانہ و بے پروا ہو جاتا ہے۔ دنیاوی مال و متاع اور جاہ و حشم سے تہی دامنی ہی عاشق صادق کے لیے سرمایہ حیات ہے۔ عشق میں حسن مٹ کر فنا ہو جاؤ تا کہ کمال و تمام حاصل ہو سکے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ جو مر کر فنا ہو جاتا ہے وہی تمام ہوتا ہے۔

خستگان غم عشق تو فقیرند و غنی　　تشنگان لب لعل تو شقی اند و سعید
گر حسن افلاس می ورزد مرنج　　مایۂ عاشق تہی دستی بود
در عاشقی بمیر حسن تا شوی تمام　　نشنیدۂ ہر آں کہ بمیرد تمام شد

انہوں نے جا بجا عشق کو عقل اور علم رسمی پر فوقیت دی ہے کیوں کہ وہ سرتاپا دریائے محبت میں غرق ہیں۔

طبیب علم ندارد ز درد و ضربت عشق　　چہ سود مند بود شربتے کہ او فرمود

عشق میں فنائے کلی، رضائے مطلق اور نیاز مندی شرط ہے امیر حسن کو یہ نیاز بدرجہ اتم حاصل ہے اور سوا حضرت معشوق بے نیاز کے اس کی خبر کسی کو بھی نہیں۔

نیازے کہ در عشق دارد حسن   ندانند بجز حضرت بے نیاز

وہ گناہ وثواب کی گفتگو فرمانے کے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ عاشقوں کے لیے پارسائی روا نہیں کیوں کہ ان کی تخلیق ہی گناہ یعنی عشق پر ہوئی۔ عاشقوں کا سارا گناہ معشوق کا عشق ہے۔ یہ چیز بھی جان کو فروخت کر کے حاصل ہوئی، وہ جنت و دوزخ کے خیال سے بلند ہیں کیوں کہ انہیں محبت معشوق حاصل ہے جو تمام چیزوں کی اصل ہے۔

سوا معشوق حقیقی سے عشق و محبت کے ان کے دل میں کسی چیز کی گنجائش ہی نہیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، عبادت، مرنا، جینا، کھانا پینا، ہر فعل اسی سے وابستہ ہے۔ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

نزیبد عاشقاں را پارسائی   کہ ایشاں را گنہگار آفریدند

دل چارہ گر محبت تست   بیچارہ جز ایں گنہ نہ دارد

اے روئے تو ماہ محفل ما   جز عشق تو نیست در دل ما

ما عشق ترا بجاں خریدیم   اینست ز عمر حاصل ما

از خلد و نعیم بے نیازیم   تا کوئے تو گشت منزل ما

بے دوست اگر عاشق فردا بہشت آید   نعمت کدۂ رضواں آتش کدہ پندارد

محبوب کے بغیر اگر عاشق کل کو جنت میں جائے گا تو وہ بھی اس کو جہنم لگے گی۔

انہوں نے راہ سلوک میں ہمہ وقت تضرع و انابت اور التجا و التماس کے دامن کو بڑی مضبوطی سے تھامے رکھا اور بار بار عرض کیا کہ ان کے تمام گناہوں و غلطیوں سے صرف نظر فرما اس لیے کہ تیری ذات سے ہمیشہ لطف و کرم اور عاجز بندہ کی جانب سے جرم و گناہ ہی سرزد ہوتے ہیں۔ دنیا میں تیرے سوا کوئی نہ ہمدم ہے نہ غم گسار، تمام سابقہ لغزشوں اور بشری لوازم سے پردہ پوشی فرما گناہوں کے بوجھ سے زیر بار، عفو و کرم اور درگذر کا پیاسا محتاج ہوں اپنے بحر کرم سے سیراب کر۔

یک جرعہ پردہ بشو جملہ گناہان حسن   از تو چہ آید جز کرم و ز ما چہ آید جز گنہ

ما را بجز تو در ہمہ آفاق یار نیست مشفق تر از غم تو دگر غم گسار نیست

یارب بکش خط کرم بر سیئات ما مضیٰ پرہیز ہا کردم و لے جاء القضاء ضاق الفضا

درماندم از بار گراں لب خشک چوں دامن تراں زبر اکرم سیلے براں بر کرد ہائے ما مضیٰ

ہم چو حسین ام خستہ تن از جور مشتے شور فن چشم رضا نہ بر حسن حق علی مرتضیٰؓ

زکات چشم چشمے کن بہ سوئے چشم از رحمت کہ چشم را بجز چشمت دگر چشمے نمی سازد

(آنکھ کی زکات دیکھنا ہے میری جانب نگاہ کرم فرمایئے کیوں کہ میری آنکھ سوا آپ کی آنکھ کے کسی کو خاطر میں نہیں لاتی)۔

گر حسن قدر غمت نشناخت اورا عفو کن پیش عفو کامل تو جرم مشت خاک چیست

(اگر حسن نے تیرے عطا کردہ درد و غم کو نہ پہچانا تو اسے معاف فرما۔ تیری عفو کامل کے سامنے اس مشت خاک کے جرم کی حقیقت ہی کیا ہے)۔

کلام پاک میں ارشاد ہے کہ ہم نے اس امانت کو آسمانوں و زمین پر پیش کیا مگر سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا لیکن انسان نے اٹھالیا وہ ظلوم و جہول ہے: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۔ (سورۃ الاحزاب: ۷۲) امیر حسن فرماتے ہیں۔

بار امانت تو زسر کے نہم فرو گر نام من ظلوم کنی یا لقب جہول

(تیری امانت کے بوجھ کو کیسے اتار سکتا ہوں چاہے تو مجھے ظلوم کہے یا جہول)۔

راہ خدا طلبی میں خود فراموشی اور خودی سے رہائی شرط اولین ہے۔ دَعْ نَفْسَكَ وَ تَعَالْ (اپنے نفس کو چھوڑ کر ہمارے پاس آجاؤ) خویش کن از خود جدا و ز خویش ہم بیگانہ شو۔ اپنے آپ کو اپنے سے جدا کرو اور پھر اپنے سے بھی بیگانہ ہو جاؤ۔

فرماتے ہیں کہ جو اپنے آپ سے باہر نہ نکلا وہ اپنے مقصود اصلی تک نہ پہنچ سکا میں نے عشق جیسے مشفق و مہربان استاد کو پا کر تختی دل سے کون و مکاں کے سارے نقش و نگار مٹا دیئے۔

ہر کہ نامد ز خویشتن بیروں او بمقصود خویشتن نہ رسید

من بشستم لوح دل از ہر دو کون عشق مشفق اوستادے داشتم

وہ مقام قلندریت پر فائز ہونے کے بعد اس کا برملا اظہار بھی فرماتے ہیں۔

ما قلندر پیشہ ایم از کفر و ایمان فارغیم　　دوست میدانیم بس کعبہ چہ باشد دیر چہ

(یار ہم جانتے ہیں کہ کعبہ کیا ہے دیر کیا ہے ہم قلندر ہیں ہم کفر وایمان سے فارغ وآزاد ہیں)۔

دوسری جانب راہ سلوک کی پیمائی میں فرحت وانبساط کے ساتھ ساتھ انقباض وکلفت کے مقامات بھی آتے ہیں۔ یافت کے ساتھ کبھی نایافت ونارسائی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ہجر و فراق، اتصال وافتراق کی کیفیات سے سالک دوچار ہوتا رہتا ہے۔

چشم تو جور می کند لعل تو دادمی دہد　　ہر چہ بغمزہ می کشی زندہ ہمی کنی بلب

کبھی غمزہ وناز سے عاشق شوریدہ سر کو لب گور کرتا ہے اور کبھی لطف وکرم اور خطاب سے اسے زندگی بخشتا ہے، چشم شوخ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ عاشق کے دل میں بعد وفراق اور خودی کے پندار سے بیماری کا احساس پیدا ہو کبھی غم کے خمار سے جسم زیروزبر ہوتا ہے اور کبھی معشوق کی نگاہ التفات سے ایک مستی وسرخوشی کا عالم طاری ہوتا ہے۔ استغنا و بے التفاتی اس کے لوازم ہیں جو ایک نگاہ میں ہستی سے نیستی کا سفر کراتی ہیں۔

اس کی بے الفتی و استغنا　　ساز و سامان نامرادی ہے

(شاہ تراب علی قلندر کاکوروی)

مگر اس بے الفتی واستغنا کے باوجود چشم شوخ وبیباک وجفا کار کی عشاق نوازیاں سوختہ دلوں کو جمال کے مشاہدہ سے نواز کر تن مردہ میں جان تازہ ڈالتی ہیں اور فیضان کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کرتی ہیں۔ وصل کی ایک گھڑی عاشق شوریدہ سر کے لیے ہزار سال سے زائد اہم وبہتر ہوتی ہے۔

آں روز ہزار سال گیریم　　روزے کہ تو با حسن نشینی

دوسری جانب ہجر وفراق کی کیفیت آشفتہ حال کے لیے سخت جاں گسل ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس کی جدائی میں دل پر پہاڑ جیسا بوجھ ہے بلکہ پہاڑ بھی جدائی جیسے غم کو برداشت نہیں کر سکتا۔ حسن تیرے فراق کے غم میں راتوں کو جاگتا رہتا ہے۔ جاگنا چاہیے بھی، تعجب تو اس عاشق پر ہوتا ہے کہ اسے محبوب کے بغیر نیند کیسے آتی ہے۔

از فراق او غمے بر سینہ دارم ہم چو کوہ کوہ ہم نتواند ایں غم را نمودن احتمال

ہیچ شب در غمت نخفت حسن عجباً للمحب کیف ینام

رضا بالقضاء بھی سالکان راہ طریقت وحقیقت کے لیے ایک لابدی صفت ہے یعنی ان پر جو واردات اور امور ایسے وارد ہوں جن کے دفعیہ کا علاج نہ ہو ان پر صبر وتسلیم ورضا فتح مندی کی علامات ہیں۔ جب احکام الٰہی پر مکمل طور پر راضی ہو جاتا ہے تو تمام احکام اس کے مطلوب بن جاتے ہیں۔

چوں قضائے حق رضائے بندہ شد حکم او را بندۂ خواہندہ شد

امیر حسن کے کلام میں جابجا رضائے الٰہی پر صبر وشکر، تقدیری امور کے آگے سر تسلیم خم، نیکی وبدی زمانہ پر شکوہ وشکایت کے دفتر نہ کھولنے اور ہر چہ از دوست می رسد نیکوست پر کاربند رہنے کی تلقین ملتی ہے۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں محبت کے لوازم ہیں۔

دل نہادم بہ ہر حکم کہ از تقدیر ست ترک تدبیر پسندیدہ تریں تدبیر است

حسن ز نیک و بد روزگار شکوہ مکن خوش ست ہر چہ کہ از واجب الوجود آید

انیست بزرگ نعمتے صبر بحالت بلا دام بلا قبول کن چوں زدۂ دم ولا

(وہ اس دام بلا میں اسیر ہونے پر اپنی ثابت قدمی کو بھی بڑی ادا سے بیان کرتے ہیں کہ واللہ اگر تم میرے دل پر تیر برساؤ گے تو ہر بار جگر سے تیر نکال کر تم کو دوں گا کہ لو اور چلاؤ)۔

واللہ ار تیر زنی بر جگرم، ہر بارے از جگر بر کشم و باز بدست تو دہم

وہ اپنے حال وکیفیت کا اظہار یوں بھی کرتے ہیں کہ حسن نے تو رضا وخوشنودی کی وجہ سے کسی اور کو تیرے سوا نہ بنایا تو تیرے بھی شایان شان یہ نہیں کہ اس کے سوا کسی اور کی طرف نگہ التفات کرے۔

حسن از طریق رضائے تو دگرے نکردہ بجائے تو نہ سزد کنوں بہ وفائے تو کہ بجائے او دگرے کنی

بعد ازاں کبھی کبھی وہ اپنی نایافت کی کیفیت بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک زمانہ اس کے وصال کے جام شیریں سے سرمست وشادکام ہو گیا ہے۔ حسن کو اس کے حصہ کا گھونٹ اب تک نہ ملا۔ تیرے انتظار میں جان لبوں پر آچکی ہے مگر تو اب تک نہیں آیا۔ حسن تیرے وصال کا ہمیشہ

جویا ہے مگر شاید یہ ممکن نہ ہوگا کیوں کہ حضرت سلیمانؑ کا ملک چیونٹی کے ہاتھ کیسے آسکتا ہے۔

عالمے مست شد ز جام لبش جرعۂ حصۂ حسن نہ رسید

مدتے در انتظار مقدمت بود ست جاں جان مسکیں برلب آمد تو نمی آئی ہنوز

وصل تو جوید حسن ہٰذا محال کے رسد ملک سلیمانی بہ مور

وہ اس امر کا بھی اظہار فرماتے ہیں کہ ارباب تصوف صرف معشوق حقیقی کے طلب گار و جویا رہتے ہیں، حور و قصور جنت و دوزخ کے تصور سے بلند ہو کر اسی کی رضا کے خواستگار رہتے ہیں۔ اخلاص ان کے یہاں اولین شرط ہے۔ وہ دعا تک کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ اگر تمہاری دعا قبول نہیں ہوتی تو رنج مت کرو تمہاری زبان الگ، دل الگ، ایسے میں دعا کیا کرے۔

حسن دعائے تو گر مستجاب نیست مرنج ترا زباں دگر و دل دگر دعا چہ کند

اگر بہشت برندم نظر ز حور بہ بندم دریں جہاں و دراں نیز در وفائے تو باشم

در جفا چہ کشائی چو در وفائے تو باشم رہ بلا چہ نمائی چو مبتلائے تو باشم

سفر برائے تو پویم حضر برائے تو جویم سخن برائے تو گویم خمش برائے تو باشم

اگر ز بحر غم تو ہزار موج بر آید چہ باک دارم از آنہا چو آشنائے تو باشم

یعنی اگر بہشت لے جائیں تو حوروں پر نگاہ بھی نہ ڈالوں، میں دونوں جہان میں تیری محبت و وفا میں بسر کرتا ہوں۔ جب تیری وفا کی راہ میں ہوں تو تو مجھ سے جفا کا معاملہ کیا کرتا ہے میں خود تیرے سلسلہ میں ابتلا میں گرفتار ہوں تو بلا و آزمائش میں کیوں مبتلا کرتا ہے۔ تیرے لیے سفر کرتا تیرے ہی واسطے قیام کرتا، تیری خاطر بولتا اور تیری ہی وجہ سے چپ رہتا ہوں۔ اگر بحر غم سے ہزار ہا موجیں اٹھیں تو بھی مجھے کوئی خوف و غم نہیں کیوں کہ میں تو تیرا آشنا ہوں۔

وہ حضوری قلب کے ساتھ خلوت در انجمن کا لطف اٹھاتے ہیں کہ تو جہاں کہیں بھی ہو میں تیری یاد میں گرفتار ہوں، اگر پردہ اٹھا دے تو چہرہ دیکھتا رہ جاؤں تیرے کوچہ کے علاوہ میرا کوئی کعبہ نہیں اگر اپنا چہرہ پھیرے گا تو میں بھی اپنا قبلہ اسی طرف موڑ لوں گا پورا شہر اطاعت میں مصروف اور میں خرابات میں ہوں۔ مخلوق کعبہ کے دروازہ پر اور میں بیاباں میں ہوں۔

خرابات کے سلسلہ میں مشہور عارف و صوفی شیخ محمود شبستری صاحب گلشن راز فرماتے ہیں:

خرابات از جہاں بے مثالی ست مقام عاشقاں لا ابالی ست

(خرابات، عاشقانِ لاابالی کا ٹھکانا اور جہان بے مثالی ہے)

ہر گاہ نہاں باشی با یاد تو مشغولم گر پردہ براندازی در روئے تو حیرانم

خود نیست مرا قبلہ جز کعبۂ کوئے تو گر روئے بگردانی من قبلہ بگردانم

شہرے بہ صف طاعت من ہم بخرا باتم خلقے بدر کعبہ من ہم بہ بیابانم

مولانا نظامی گنجوی نے فرمایا تھا:

نہ محتاجم بہ گلگشت چمن اے باغباں ہرگز بہار صد چمن در عارض جانانہ می بینم

(باغباں! میں قطعی چمن کی سیر کا محتاج نہیں میں تو سیکڑوں باغوں کی بہار محبوب کے عارض دلربا میں دیکھتا ہوں)۔

امیر حسن سجزی فرماتے ہیں ۔

بر روئے تو ام فتنہ من باغ چرا جویم بر قد تو ام عاشق من سرو کجا دیدم

جز عشق نمی خواہم از جملہ حاجتہا تا طاق دو ابرویت محراب دعا دیدم

(میں تو تمہارے چہرہ پر فدا ہوں باغ کیوں ڈھونڈوں، تمہاری قامت پر عاشق، سرو سے کیا مطلب (کیوں اسے دیکھوں) جب دونوں ابرو محراب دعا نظر آئیں تو پھر سوائے عشق کے کچھ نہیں چاہتا)۔

فارسی کے مشہور شاعر معزی نے زمانہ جاہلیت کے عظیم ترین عربی شاعر امرؤالقیس کے لامیہ قصیدہ کے مطلع کے تتبع میں کہا تھا:

اے سارباں منزل مکن جز بر دیار یار من تا یک زماں زاری کنم بر ربع واطلال ودمن

(اے سارباں میرے محبوب کے دیار کے سوا کہیں پڑاؤ نہ ڈالنا تاکہ میں اس کی قیام گاہ کے ٹیلوں ونشانات پر اس کی یاد میں رولوں)۔

حسن سجزی نے شعر کے پہلے مصرعہ پر تضمین کہی:

مانند یار خویشتن دیگر کجا یابد حسن جز بر دیار یار من اے سارباں منزل مکن

(حسن کو اپنے محبوب جیسا دوسرا کہاں ملے گا اے سارباں میرے محبوب کے در کے سوا کہیں نہ رکنا)۔

ان کے دیوان کی غزلوں میں صوفیانہ افکار تو ملتے ہی ہیں جس کا اندازہ سابقہ سطور سے

لگایا جا سکتا ہے مگر مثنویات بھی درویشانہ افکار اور اخلاقی تعلیمات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

انسان کو ہر حال میں دوسروں کے ساتھ بھلائی و نیکی کرتے رہنا چاہیے، دنیا کی بے ثباتی کی بنا پر اس میں دل نہ لگانا چاہیے کیوں کہ اس نے کسی کے ساتھ بھی وفا نہ کی۔ انسان جب تک زندہ رہے اپنا محاسبہ کرتا رہے (اپنے کو دیکھتا رہے) تا کہ اس کا نام رہ جائے کیوں کہ اس دنیا میں مشہور لوگوں میں بھی سب رخصت ہو گئے صرف نام رہ گیا۔

حضرت حسن سجزی فرماتے ہیں:

نکوئی کن بہ ہر راہے کہ پوئی نکوئی را چہ آید جز نکوئی
جہاں را چو وفائے نیست حاصل مبند ید از جہانِ بے وفا دل
نگر خود تا چہ ماندست اندر ایام از آں نام آوراں رفتہ بجز نام

ان کے کلام میں عربی فقرات بھی جا بجا ہیں:

گر لاف زنند فاعف عنهم فاصفح ہر طائفہ بما لديهم فرحون

(اگر وہ لاف زنی (ڈینگیں ماریں) تم ان کو معاف کر دو اور چھوڑ دو ہر گروہ کے پاس جو ہے وہ اسی میں خوش ہیں)۔

پہلا مصرعہ سورۂ بقرہ کی ۱۰۹ ویں آیت سے مستفاد اور دوسرے مصرعہ میں سورۂ روم کی ۳۲ ویں آیت کل حزب بما لديهم فرحون کو لیا گیا ہے۔

ایک عربی غزل چھوٹی بحر میں درج ہے۔

حبيبی مهجتی قلبی منائی ترحم حالتی وانظر بكائی
شربنا شربة فی يوم هجر بصحراء الفراق من فضائی
وجودی مولم قلب جريح فراشی حزن و همی متكائی
رجائی فی لقاكم يا حبيبی شفائی فی شفاكم يا شفائی
اذا ما انت عنی غاب روحی چہ بودے گر نبودے آشنائی

(میرے محبوب، میری زندگی، میرے دل و جان، میری حالت زار پر رحم کر میرے رونے پر نگاہ کرم فرما، ہم نے جدائی کے صحراء میں ہجر کے دن پیالہ پیا۔ پورا وجود غمزدہ، دل (جدائی کے نشتر

سے)زخمی۔ بستر رنج اور تکیہ (سراپا) غم ہے میرے محبوب تمہاری ملاقات میرا آسرا۔ اے میری شفا میری تندرستی تمہارے لب ہیں۔ جب تم آنکھوں سے اوجھل ہوئے تو میری روح بھی نکل گئی کیا ہوتا اگر آشنائی نہ ہوتی)۔

حضرت حسن سجزی کو سعدی ہند کہا جاتا ہے اور کہنے والے بڑی حد تک حق بجانب ہیں۔ بلاشبہ سعدی شیراز حضرت مصلح الدین کا اپنا الگ مقام ہے جس میں کوئی ان کا شریک و مقابل نہیں۔ مگر ہندوستان کے طول وعرض کے صدہا نہیں بلکہ ہزار ہا فارسی شعرا کے درمیان امیر حسن کا بالکل منفرد مقام ہے۔ ان کا کلام نزاکت، شوخی اور تغزل میں اپنی مثال آپ ہے۔ صرف دو اشعار ملاحظہ ہوں:

اے حسن بوسہ بپائش زدنت بے ادبی ست　　پائے نازک نہ شود رنجہ ز بوسیدن تو

(حسن محبوب کے پاؤں کو بوسہ دینا بھی (ایک طرح کی) بے ادبی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے بوسہ دینے سے اس کا نازک پاؤں دکھ جائے)۔

بازم ایں ساعت ازاں روئے نکو یاد آمد　　گل بخندید و مرا خندہ او یاد آمد

(مجھے اس وقت پھر وہ حسین چہرہ یاد آیا۔ پھول کھلا تو اس کا مسکراتا چہرہ سامنے آگیا)۔

حوالے

(۱) بہارستان جامی، اخبار الاخیار، نوادر ملخص سید احسن شیر وغیرہ۔ (۲) قصیدہ در کلیات۔ دیوان حسن سجزی دہلوی مرتبہ مسعود علی محوی، مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد دکن ۱۳۵۲ھ۔ (۳) بحوالہ دیوان حسن سجزی مصدر سابق۔ (۴) تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی، سرسید اکاڈمی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص ۳۵۰۔ (۵) تاریخ فرشتہ ابوالقاسم فرشتہ، نول کشور، لکھنؤ، ص ۲۹۵۔ (۶) نفائس المآثر (مخطوطہ) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۶۴۔ (۷) سفینۃ الاولیاء، شہزادہ محمد داراشکوہ، نول کشور، ۹۸۔ (۸) سیر الاولیاء، امیر خورد کرمانی، محبّ ہند دہلی، ۳۰۸۔ (۹) دیباچہ دیوان حسن سجزی، مصدر سابق، ص ۷۴۔ (۱۰) تذکرۃ الشعراء، دولت شاہ سمرقندی، علوی پریس، ۱۸۸۷ء، ۱۰۸۔ (۱۱) بہارستان جامی سلسلہ انتشارات کتابخانہ مرکزی خیاباں شاپور، ۱۱۶۔ (۱۲) دیباچہ دیوان از مسعود علی محوی مصدر سابق، ۷۵۔ (۱۳) مصدر سابق، ص ۷۵۔

سیرت حلبیہ پر کی گئی تنقید کا جائزہ

ڈاکٹر نوید احمد شہزاد

سیرت حلبیہ کے مصنف امام علی بن برہان الدین حلبی کا تعلق مصر کے مشہور شہر قاہرہ سے تھا۔ دور حیات ۹۷۵ھ بمطابق ۱۵۶۷ء تا ۱۰۴۴ھ بمطابق ۱۶۳۵ء ہے۔ اپنے دور کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے۔ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں مگر مشہور و متعارف و مقبول تصنیف انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون ہے۔ جس کو عام طور پر سیرت حلبیہ کہا جاتا ہے۔(۱)

سیرت حلبیہ پر تنقید میں کمی کا رجحان: سیرت حلبیہ اپنے وقت تالیف سے لے کر تا حال سیرت نگاروں کے درمیان متداول رہی ہے اور وہ اس سے استفادہ بھی کرتے رہے ہیں اور باوجودیکہ اس میں کئی ایسے پہلو بھی ہیں جن پر نقد و بحث موجود ہے تاہم تنقید کے حوالے سے سیرت حلبیہ پر غالباً کوئی خاص کتاب نہیں لکھی گئی اور نہ کسی سیرت نگار کا کوئی خصوصی مقالہ دیکھا گیا ہے۔ انٹرنیٹ کی ایک ویب سائٹ پر یہ کتاب موجود ہے اس سائٹ پر کتابوں کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی آراء بھی پیش کی جاتی ہیں لیکن سیرت حلبیہ کے بارے میں یہ تبصرہ درج ہے:

لا یوجد ای نقاشات حول هذا الکتاب حتی الآن ۔(۲)

اس کتاب کے بارے میں ابھی تک کوئی تنقیدی رائے نہیں ملتی۔

البتہ سیرت حلبیہ سے استفادہ کرنے والے کئی سیرت نویسوں کے چند مقامات پر کچھ تنقیدی جملے ملتے ہیں۔ جیسے حلبیہ کا اردو ترجمہ کرنے والے محمد اسلم قاسمی، اگرچہ کھل کر کم ہی حلبی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں لیکن جابجا وہ سیرت حلبیہ کے قابل تنقید مقامات کی نشان دہی کر دیتے ہیں۔ حلبی کے بعد آنے والے سیرت نگاروں کی سیرت حلبیہ پر تنقید کو درج ذیل عنوانات کے تحت پیش

فیصل آباد۔ پاکستان۔

کیا جاتا ہے:

۱-حلبی کی روایت لینے کے معیار پر اعتراض

۲-غیر متعلقہ معلومات کی کثرت کی نشان دہی

۳-مضامین کی ترتیب پر اعتراض

۴-ناقص معلومات کی نشان دہی

۵-کمزور استدلال کرنے کی نشان دہی

۶-سیرت نگاری میں متصوفانہ عقائد کی آمیزش

۷-سیرت نگاری میں شافعی مسلک کی رعایت

۸-معلومات کے ماخذ کا ابہام

روایت لینے کے معیار پر اعتراض: سیرت حلبیہ میں مولف نے بہت سی ایسی روایات بھی نقل کردی ہیں جن کے صحیح اور مستند ہونے کے بارے میں تنقید کی گنجائش موجود ہے۔ بعض اوقات حلبی ایسی مرویات بھی نقل کردیتے ہیں جن کے بارے میں ناقدین کی رائے ہوتی ہے کہ ان کو بعض فرقوں نے اپنے مسلک کی حمایت کے لیے گھڑ کر پھیلا دیا تھا۔ مثلاً حلبی نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ پر نبوت سے پہلے کبھی کبھی غشی طاری ہوجاتی تھی۔ محمد اسلم قاسمی، حلبیہ کی ان مرویات کے بارے میں تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''مگر یہ حقیقت میں سبائی روایتیں ہیں جو دشمنان اسلام کی طرف سے پھیلائی گئی ہیں''۔(۳)

سیدنا علیؓ کی شجاعت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت علیؓ کے متعدد واقعات حلبیہ میں نقل کیے گئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ جب لڑائی کے دوران دشمن سپاہی کا ستر کھل جاتا تھا تو حضرت علیؓ اس کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قاسمی مذکور لکھتے ہیں:

> ''واضح رہے کہ اس قسم کی بہت سی روایتیں شیعہ حضرات نے پیش کی ہیں جن کی سند قابل غور ہے''۔(۴)

بعض اوقات حلبی بخاری و مسلم کی مرویات پر بھی تنقید کرتے ہیں جیسے صلح حدیبیہ کے

واقعات میں معاہدہ لکھنے کے بارے میں صحیح بخاری کی روایت پر تنقید کی تو شہید مرتضی المطہری نے ان کے اس طرز عمل کی اس طرح نشان دہی کی:

"وہ بخاری کی روایت نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ بعض کا یہ دعویٰ ہے کہ اہل علم کے نزدیک اس طرح کی روایت غیر معتبر ہے اور مقصود یہ ہے کہ نبی نے کتابت کا حکم دیا نہ کہ بذات خود لکھا تھا"۔(۵)

بعض سیرت نگار حضرات کا خیال ہے کہ سیرت حلبیہ میں کثرت سے رطب و یابس روایتوں اور اسرائیلی قصے کہانیوں کو بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

فیہ حشو و قصص اسرائیلی	اس میں حشو مرویات اور اسرائیلی قصے ہیں
وقد حذف اسانید الروایات و	اور مولف نے مرویات کی اسانید کو حذف
اکتفی بذکر راوی الخبر ۔(۶)	کرکے صرف راوی کے ذکر پر بس کیا ہے۔

لیکن امام حلبی کا خیال ہے کہ سیرت اور مغازی کے واقعات میں محدثین کے معیار قبول سے کم تر مرویات بھی قبول کی جاتی ہیں۔

ولا یخفی ان السیر تجمع	اور مخفی نہ رہے کہ سیرت صحیح، سقیم، ضعیف،
الصحیح والسقیم والضعیف	بلاغ، مرسل، منقطع، معضل یعنی بجز موضوع
والبلاغ والمرسل والمنقطع	روایات کے سب کو جمع کرتی ہے۔اسی وجہ
والمعضل دون الموضوع ومن	سے الزین العراقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ
ثم قال الزین العراقی رحمہ و	طالب علم کو جاننا چاہیے کہ سیرت نویسی میں
لیعلم الطالب ان السیرا تجمع	صحیح اور منکر دونوں شامل ہیں
ما صح وما قد انکرا ۔(۷)	

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل اور دوسرے ائمہ کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ حلال و حرام کے سلسلہ میں قبول روایات میں تو سختی ہے لیکن فضائل کے باب میں نرمی کا رخ ہے۔

وہ کہتے ہیں:

وفی الاصل والذی ذھب الیہ	درحقیقت جس رائے کی طرف زیادہ تر اہل علم

كثير من أهل العلم الترخص
في الرقائق وما لا حكم فيه من
اخبار المغازي وما يجري
مجرى ذلك وانه يقبل منها ما
لا يقبل في الحلال والحرام
لعدم تعلق الا حكام بها۔(۸)

گئے ہیں وہ یہ ہے کہ رقائق اور مغازی کے وہ
واقعات جن میں احکام نہ ہوں ان میں
رخصت ہے اور ان میں وہ روایات بھی قبول
کر لی جاتی ہیں جو حلال وحرام میں قبول نہیں
کی جاتیں کیونکہ ان کا احکام کے ساتھ تعلق
نہیں ہوتا۔

یعنی امام حلبی نے سیرت طیبہ کے واقعات کو نقل کرتے ہوئے صحیح احادیث کے علاوہ ضعیف اور کمزور قسم کی روایات کو بھی قبول کیا ہے۔

حلبی پر یہ بھی اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ سیرت حلبیہ میں ایسی روایات خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کے موضوع ہونے کی صراحت مذکور ہے مگر حلبی نے ان روایات کو بغیر کسی تنقید کے دوسری روایات کی طرح ہی اعتماد سے ذکر کردیا ہے۔ اس بارے میں بطور نمونہ سیرت حلبیہ کی پانچ روایات نقل کی جاتی ہیں:

۱- جنگ خیبر کے واقعات کے بیان میں حضرت علیؓ کے لیے سورج کا غروب ہونے کے بعد دوبارہ لوٹا دیا جانا۔(۹) اس بارے میں ابن الجوزی لکھتے ہیں کہ:

قلت ومن تغفيل واضع هذا
الحديث انه نظر الى صورة
فضيلة ولم يتلمح الى عدم الفائده
فان صلاة العصر بغيبوبة
الشمس صارت قضاء فرجوع
الشمس لا يعيدها اداء۔ (۱۰)

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کو گھڑنے والے کی
غفلت سے ثابت ہے کہ اس نے محض فضیلت
بیان کرنے کی طرف دیکھا عدم افادیت پر
اس کی نگاہ نہ گئی۔ پس بے شک عصر کی نماز
سورج غروب ہونے کے بعد قضا ہوگئی۔ جس
کو سورج کا لوٹنا ادا کی طرف نہیں لاسکتا۔

۲- حمام میں داخل ہونے کی جناب ثوبان سے یہ روایت:

فقال كان رسول الله ﷺ
يدخل الحمام۔(۱۱)

پس اس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ حمام میں
داخل ہوا کرتے تھے۔

جب کہ ابن الجوزی کا قول ہے:

هذا حديث موضوع بلا شك وفي روايته جماعة مجهولون ...... ولم يدخل رسول الله ﷺ حمام قط ولا عندهم حمام ـ(۱۲)

یہ حدیث بغیر کسی شک کے موضوع ہے اور اس کی روایت میں مجہولوں کی ایک جماعت ہے......اور رسول اللہ ﷺ کبھی بھی کسی حمام میں داخل نہیں ہوئے اور نہ ہی عربوں کے ہاں حمام ہوتے تھے۔

۳-حلبی لکھتے ہیں کہ رسول اللہ کا نور پاک اصلاب سے پاک ارحام میں منتقل ہوتا رہا۔ (۱۳)اس روایت کے بارے میں ناقدین کی رائے ہے کہ:

هذا حديث موضوع قد وضعه بعض القصاص ـ(۱۴)

یہ حدیث موضوع ہے جس کو بعض قصہ گو لوگوں نے گھڑ رکھا ہے

۴-اہل عرب کی فضیلت میں حلبی لکھتے ہیں:

وقال ﷺ احبوا العرب لثلاث لاني عربي والقرآن عربي وكلام اهل الجنة عربي ـ(۱۵)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عرب سے تین باتوں کی وجہ سے محبت کرو، کیوں کہ میں عربی ہوں، قرآن عربی ہے اور اہل جنت کی زبان عربی ہے۔

ناصر الدین الالبانی اس روایت کی متعدد اسناد کا تجزیہ کرنے کے بعد اسے موضوع قرار دیتے ہیں۔(۱۶)

۵-نبوت ملنے سے پہلے غشی طاری ہونے کے بارے میں حلبی لکھتے ہیں کہ:

انه كان يعتريه وهو بمكة قبل ان ينزل عليه القرآن ما كان يعتريه عند نزول الوحي اي من الاغماء ـ(۱۷)

بے شک آپ کو مکہ میں قرآن نازل ہونے سے پہلے ایسی حالت میں مبتلا ہونا پڑتا تھا جیسا کہ وحی کے نازل ہونے کے وقت پیش آتی تھی، یعنی غشی پڑنے کی حالت۔

محمد اسلم قاسمی (مترجم سیرت حلبیہ) نے لکھا کہ:

"مگر یہ حقیقت میں سبائی روایتیں ہیں جو دشمنان اسلام کی طرف

سے پھیلائی گئی ہیں"۔(۱۸)

غیر متعلقہ معلومات کی کثرت کی نشان دہی: حلبی موضوع سے ہٹ کر غیر متعلقہ معلومات بھی بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اضافی معلومات کی وضاحت کے بعد پھر دوبارہ اصل موضوع کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ حلبی کے اس انداز پر بعض لوگوں نے نرمی اور اشارے کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے اور کسی نے واضح طور پر اس نقص کی نشان دہی کی ہے۔ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ اس بارے میں یوں صراحت کرتے ہیں:

> "دیگر کتب سیرت کے مقابلہ میں "سیرت حلبیہ" کافی مفصل ہے۔ اس ضخامت اور تفصیل کی وجہ یہ ہے کہ سیرت اور مغازی کے واقعات لکھنے کے علاوہ مصنف نے بہت سے ایسے مسائل سے بھی بحث کی ہے جن کا تعلق عقائد اور عبادات وغیرہ سے ہے"۔(۱۹)

حلبی ہجرت مدینہ کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے ام معبد کی بکری کے بارے میں معلومات دینے لگتے ہیں اور تفصیلات کے بعد ہی ام معبد کے واقعات ان کو یاد آتے ہیں اور یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا کہ پھر ام معبد کی بکری ان کو یاد آ جاتی ہے۔ مترجم سیرت حلبیہ نے اس کا سبب یہ بتایا کہ:

> "اس مسئلے میں روایت کا بقیہ حصہ شاید طباعت اور کمپوزنگ کی غلطی کی وجہ سے اس روایت کے سابقہ بیان ہونے کی بجائے درمیان سے رہ گیا ہے اور چند سطروں کے بعد بیان ہوا ہے"۔(۲۰)

حالانکہ مترجم مذکور اس کو حلبی کی عادت یا تساہل بھی کہہ سکتے تھے، کیونکہ انہوں نے حلبی کے موضوع سے ہٹنے اور دیگر معلومات بیان کرنے کی طرف کئی مقامات پر نشان دہی کی ہے۔ جیسے حلبی رسول کریم ﷺ کے والد عبد اللہ کے ذبیح کے لقب پر روشنی ڈالتے ہوئے فدیے کے سو اونٹوں پر بحث کرتے ہیں۔ پھر شرعی مسائل کی وضاحت کرتے ہوئے قدرے تفصیل سے بحث کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے دونوں بیٹوں حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ میں سے ذبیح کون تھا؟ یہاں سے وہ یہود کی کئی غلط فہمیوں پر روشنی ڈالنے کے بعد دوبارہ رسول کریم ﷺ کے

والد کے ذبح ہونے کے تذکرے کو شروع کرتے ہیں یہاں مترجم درمیان میں وضاحت کرتے ہیں کہ حلبی ''پھر اصل موضوع یعنی عبداللہ کے ذبح کے متعلق بحث کرتے ہیں''۔(۲۱)

بعض اوقات حلبی سیرت النبی کے واقعات میں غیر ضروری باتیں لے آتے ہیں، جن سے اگرچہ قاری کو عقائد احکام اور فضائل وغیرہ کے بارے میں کچھ معلومات مل جاتی ہیں لیکن یہ حلبی کی بے جا عبارت آرائی کا عیب بھی دکھا جاتی ہیں۔

حضرت اسماعیلؑ کے متعلق بیان کیا کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے گھوڑے پر سواری کی۔ ان کی پکار پر سرزمین عرب کے تمام گھوڑے سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے۔ گھوڑوں کے بارے میں عجیب عجیب باتیں ہیں۔ جیسے ذوالقرنین کے لشکر میں چھ ہزار خاص قسم کے مادہ گھوڑے تھے، جو رات میں بھی آب حیات دیکھ سکتے تھے۔ ہاتھی کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی آواز بہت کمزور ہوتی ہے اور وہ بلی سے ڈرتا ہے۔ کہیں ہندوستان کے مہاراجہ کے پیٹ پر ٹہنی پھیر کر بھوک ختم کرنے کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ایران کے بادشاہوں کے دور حکومت کا سالوں میں حساب نکالنے کا ذکر ہے۔ اس سے چند صفحے آگے چھوٹی عمر میں بولنے والے بچوں کے عجیب وغریب قصے کا ذکر ہے۔ اور ابن عربی کے حوالے سے ایک سال کی بچی کے فتوی دینے کی بات ہے۔(۲۲)

ایسی روایتوں اور قصوں کی موجودگی، یقیناً سیرت نگاری کے اصل موضوع سے انحراف ظاہر کرتی ہے۔

بے ترتیب بحث کرنا: بسا اوقات حلبی سیرت کے واقعات میں کسی موضوع پر ضمنی بحث شروع کر دیتے ہیں اور پھر اس ضمنی بحث میں کسی اور نئے موضوع کی جانب منتقل ہو جاتے ہیں۔ ضمنی در ضمنی موضوعات کا یہ سلسلہ طویل ہوتا جاتا ہے۔ جیسے تحویل قبلہ کے حالات میں رسول اللہ ﷺ کے خطبہ اور منبر کے ذکر میں کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے منبر کب بنوایا تھا۔ پھر یہ کہ یہ منبر کس چیز سے بنایا گیا تھا اور یہ کیسا تھا۔ پھر بنی امیہ اور مصری سلاطین کے منبروں کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور بات قرطبہ کی جامع مسجد کے منبر کی شروع ہوتی ہے تو مسجد قرطبہ کے دیگر عجائبات کے تعارف تک پہنچتی ہے۔ پھر دوسرے سلاطین اور خلفاء کے منابر کی تفصیلات بھی سامنے آنے لگتی ہیں۔(۲۳)

سیرت حلبیہ کے مضامین کی ترتیب پر اعتراض: سیرت حلبیہ میں معلومات کو پہلے زمانی

ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے۔ ابتداء میں قبل از بعثت، پھر مکی زندگی، ہجرت مدینہ اور پھر مغازی و سرایا کا بیان ہے اور اس کے بعد وفود، مکاتیب، حجۃ الوداع، معجزات، خصائص اور اعزہ و اقرباء وغیرہ کا ذکر ہے۔ آخر میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کا بیان ہے۔ (۲۴) سیرت ابن ہشام میں بھی تقریباً ایسی ہی زمانی ترتیب ہے۔ ابن سید الناس نے عیون الاثر میں پہلے زمانی ترتیب سے واقعات کے بعد مخصوص پہلوؤں پر الگ سے معلومات پیش کی ہیں۔ حلبی نے عیون الاثر کو ہی بنیاد بنایا ہے اور اضافی معلومات سیرت شامیہ سے لی ہیں۔

ناقص معلومات کی نشان دہی: حلبی کی نقل کردہ بعض معلومات ایسی ہیں جن کے بارے میں کہا گیا کہ یہ مولف کی بیان کردہ معلومات اصل مآخذ سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتی ہیں۔ جیسے سماع کے بارے میں حلبی مسلک شافعی اس طرح بیان کرتے ہیں:

استدل ائمتنا علی جواز الرقص حیث خلا عن التکسر ۔(۲۵)	ہمارے ائمہ نے رقص کے جائز ہونے پر استدلال کیا ہے، جب وہ جسم کو بل دینے سے خالی ہو۔

اس کے بعد اگلی سطروں میں لکھتے ہیں:

استدل ائمتنا علی جواز الضرب بالدف ولو فیہ جلاجل ۔(۲۶)	ہمارے ائمہ نے دف بجانے کے جواز پر استدلال کیا ہے اگرچہ اس میں جھانجیں ہوں۔

یعنی سماع کے جواز کے بارے میں وہ مسلک شافعی بیان کرتے ہیں۔ اس پر کہا گیا کہ:

''یہاں امام شافعی کا مسلک سماع کو جائز قرار دینے کا بیان کیا گیا ہے مگر ابن تیمیہ نے ہی امام شافعی کا مسلک یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا میں بغداد میں ایک ایسی چیز چھوڑ کر آیا ہوں جسے دہریوں نے ایجاد کیا ہے۔ یعنی گانا بجانا اس کے ذریعہ سے انہوں نے لوگوں سے قرآن پاک چھڑا دیا''۔(۲۷)

اسی طرح اگر کوئی عورت اپنے بچے کو کعبہ کے نزدیک ذبح کرنے کی منت مانے تو حنفی قول یہ ہے:

و عند ابی حنیفۃ و محمد یلزمھا ذبح شاۃ فی ایام النحر فی الحرم	ابوحنیفہ اور محمد کے نزدیک اس عورت پر قربانی کے دنوں میں حرم کی حدود میں بکری کی قربانی

اخذ من قصة ابراهيم الخليل عليه الصلاة والسلام ۔(۲۸)	دینا لازم ہوگی ۔ یہ استدلال انہوں نے ابراہیمؑ کے قصے سے کیا ہے۔

لیکن محمد اسلام قاسمی کہتے ہیں:

''مسئلہ یہی ہے مگر یہ شرط امام صاحب سے ثابت نہیں ہے کہ بکری کی قربانی حرم میں ہو اور قربانی کے دنوں میں ہو''۔(۲۹)

رسول اللہ ﷺ کے ''محمد'' نام رکھنے کے بارے میں کئی مرویات ہیں، ایک روایت سیدہ آمنہ کے حوالے سے ہے کہ سونے اور جاگنے کی کیفیت کے درمیان میں کسی نے کہا:

سميه محمدا فان اسمه فى التوراة والانجيل احمد يحمده اهل السماء والارض وفى القرآن محمد ۔(۳۰)	تم اس کا نام محمد رکھنا کیونکہ اس کا نام تورات و انجیل میں احمد ہے۔ آسمان و زمین والے اس کی تعریف کریں گے اور قرآن میں محمد ہے۔

سیرت حلبیہ اردو کے مرتب لکھتے ہیں:

''راقم الحروف نے البدایہ والنہایہ میں یہی روایت دیکھی ہے مگر اس میں یہ بعد والا حصہ نہیں ہے جس سے حضرت آمنہ کو قرآن کے متعلق علم ہو سکے''۔(۳۱)

اصل مآخذ سے مطابقت نہ ہونے کے متعلق مترجم اردو کی کچھ باتیں درست کہی جا سکتی ہیں اور کچھ غلط بھی ۔ جیسے مذکورہ قول، خود درست نہیں رسول اللہ ﷺ کی ولادت شریف کا ذکر کرتے ہوئے جو روایت ابن کثیر نقل کرتے ہیں، اس میں '' اسمه فى القرآن محمد'' کے الفاظ واضح طور پر موجود ہیں۔(۳۲)

اسی طرح مسئلہ سماع میں حلبی نے شوافع کا جو مسلک نقل کیا ہے وہ متعدد کتب فقہ میں موجود ہے، جیسا کہ امام نووی نے روضۃ الطالبین میں ذکر کیا ہے۔(۳۳) البتہ قاسمی صاحب نے احناف کے مسئلہ پر جو گرفت کی ہے وہ بالکل درست ہے۔ حلبی کے بعض حوالے بھی اصل میں نہیں ملتے۔ ابن ماجہ کے حوالے سے یہ روایت بیان کی گئی کہ

والذى رواه ابن ماجه رحمه	اور وہ جو ابن ماجہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ

اللہ انہ تولی غسلہ علیہ وسلم علی	نبی ﷺ کے غسل دینے کی ذمہ داری علی اور
والفضل واسامۃ بن زید یناول	فضل کو سونپی گئی اور اسامہ بن زید پانی پکڑا
الماء العباس واقف۔(۳۴)	رہے تھے جب کہ عباس کھڑے تھے۔

مذکورہ روایت کے الفاظ سنن ابن ماجہ میں نہیں ملتے۔ زاد المعاد کے حوالے سے دو عبارتیں نقل کی گئیں، ایک:

وفی الھدی فبعثہ عمہ مع	اور زاد المعاد (الہدی) میں ہے کہ آپ کو آپ
بعض غلمانہ الی المدینۃ	کے چچا نے اپنے بعض غلاموں کے ساتھ
فلیتامل۔(۳۵)	مدینہ بھیج دیا، اس پر غور کرنا چاہیے۔

اس میں ''المدینۃ'' کا لفظ ہے جب کہ زاد المعاد میں یہ ''المکۃ'' ہے۔ یہی صحیح ہے کہ ابوطالب اپنے بھتیجے کو بحیرا راہب سے ملاقات کے بعد مکے ہی واپس بھیجنا چاہتے تھے جیسا کہ سیرت کی دیگر کتابوں میں بھی وضاحت ہے۔(۳۶)

دوسری عبارت بیعت عقبہ ثانیہ کے ذکر میں شیطان کے چیخنے کے متعلق ہے کہ:

وفی الھدی یا اھل الاخاشب	اور زاد المعاد میں ہے کہ اے اخاشب والو!
ھل لکم فی مذمم والصباۃ	کیا تمہیں مذمم اور اس کے بے دین ساتھیوں
معہ۔(۳۷)	کے بارے میں کوئی خبر ہے۔

زاد المعاد میں ''الاخاشب'' کی جگہ ''الجباجب'' کا لفظ ہے۔(۳۸)

اسی طرح حافظ ابن حجر کی الاصابہ کے حوالے سے دو عبارتیں بھی جزوی طور پر اصل ماخذ سے مختلف ہیں۔ جیسے معمر ترین صحابی کا نام الشیخ زین الدین المعمر نقل کیا گیا ہے۔(۳۹) مگر الاصابہ میں ''رتن المعمر'' مذکور ہے۔(۴۰)

رسول اللہ ﷺ کے شام کے سفر کے حالات میں حلبی نے یہ عبارت نقل کی:

ومن ثم ذکر الحافظ ابن حجر	اس وجہ سے حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں
فی الاصابۃ ان بحیرا ممن ذکر	ذکر کیا ہے کہ جس شخص نے بحیرا کو صحابہ میں
فی کتب الصحابۃ غلطًا قال	لکھ کر ذکر کیا ہے اس نے غلط کیا ہے۔ انہوں

لان تعريف الصحابي لا ينطق عليه ۔(۴۱)	نے کہا کیونکہ صحابی کی تعریف اس پر چسپاں نہیں ہوتی۔

جب کہ اصل عبارت یہ ہے:

وانما ذكرته في هذا القسم لان تعريف الصحابي لا ينطق عليه ۔(۴۲)	اور بے شک میں نے اسے اس قسم میں اس لیے ذکر کیا ہے کیونکہ صحابی کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی۔

غزوہ دومۃ الجندل کے بیان میں لفظ ''دومۃ'' کا تلفظ ذکر کرتے ہوئے حلبی لکھتے ہیں:

ومن ثم قال الجوهري الصواب الضم واخطأ المحدثون في الفتح ۔(۴۳)	اور اسی وجہ سے جوہری نے کہا کہ درست رائے (لفظ دومۃ کی دال) پر ضمہ ہونا ہے اور محدثین نے اس پر فتح پڑھ کر غلطی کی ہے۔

جوہری کے حوالے سے حلبی کا مذکورہ اقتباس ''الصحاح'' میں نہیں مل سکا۔

استدلال کا کمزور محسوس ہونا: حلبی نے کئی جگہ نتیجہ اخذ کرکے اپنی رائے بھی پیش کی ہے۔ جیسے دوسری جنگ فجار کا سبب یہ بتایا کہ یہ جنگ ایک عورت کا زبردستی نقاب اتروانے پر ہوئی اور نتیجہ یہ اخذ کیا کہ:

يدل على ان النساء في الجاهلية كن يأبين كشف وجوههن ۔(۴۴)	یہ واقعہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جاہلیت میں عورتیں اپنے چہروں کو کھولنے سے انکار کرتی تھیں۔

اس کے متعلق کہا گیا کہ:

''اگرچہ اس روایت سے تو یہی معلوم ہوتا ہے مگر دوسری بہت سی روایتیں وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں عورتیں کھلے منہ پھرتی تھیں۔ اس لیے بظاہر اس ایک روایت سے یہ نتیجہ نکالنا درست معلوم نہیں ہوتا''۔(۴۵)

رسول اللہ کے بچپن میں ستر کھلنے کے بارے میں دو واقعات نقل کرکے تجزیہ کرتے ہیں

کہ دوسری بار ستر کھولنے کا واقعہ کیوں کر ہوا؟

یجوز ان یکون صلی اللہ علیہ وسلم لم یفہم ان امرہ بستر عورتہ اولا عزیمۃ بل جواز الترک وفی الثانیۃ علم انہ عزیمۃ ۔(۴۶)

ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلی دفعہ شرم گاہ کے ستر کے حکم سے اس کو قطعی نہ سمجھا ہو بلکہ چھوڑنے کا جواز بھی سمجھا جب کہ دوسری مرتبہ اس کو قطعی حکم کے طور پر جانا ہو۔

محمد اسلم قاسمی نے اس رائے کو بھی محدثین کی رائے سے متصادم قرار دیا ہے اور دوسرے واقعہ کے رونما ہونے کو نا ممکن قرار دیا ہے کیونکہ اس وقت آپ ﷺ کی عمر پینتیس[۳۵] برس تھی۔(۴۷)

سیرت حلبیہ میں ایسے مقامات بھی کافی تعداد میں ہیں جہاں حلبی نے حتمی فیصلہ سے گریز کرتے ہوئے قاری کو خود سے رائے قائم کرنے کی ترغیب دی ہے۔ استدلال اور نتیجہ اخذ کرتے ہوئے حلبی کا یہ رجحان ان کے محتاط رویے کو ظاہر کرتا ہے۔(۴۸)

متصوفانہ عقائد کی آمیزش پر نکتہ چینی: حلبی کا تصوف کی طرف خاصا رجحان تھا، جس کے اظہار پر نکتہ چینی بھی کی گئی۔ جیسے سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات کی تفسیر میں ابوالحسن الشاذلی کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

ان الشیخ ابا الحسن الشاذلی نفعنا اللہ تعالیٰ ببرکاتہ قال رأیت رسول اللہ ﷺ فی النوم فقال یا ابا الحسن طہر ثیابک من الدنس تحظ بمدد اللہ تعالیٰ فی کل نفس فقلت یا رسول اللہ وما ثیابی قال ان اللہ کساک حلۃ التوحید وحلۃ المحبۃ وحلۃ المعرفۃ قال ففہمت حینئذ قولہ تعالیٰ

بے شک شیخ ابوالحسن الشاذلی نے کہا (اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی برکات سے مستفید فرمائے) میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوالحسن اپنے کپڑوں کو میل سے پاک کر۔ تو اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہر نفس میں اتر آئے گا۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول اور میرے کپڑوں سے کیا مراد ہے۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تمہیں توحید کا حلہ، محبت کا حلہ، معرفت کا حلہ پہنائے گا۔ (شاذلی) کہتے ہیں کہ تب میں

سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان (وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ) سے کیا مراد ہے۔ (وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ) ۔(۴۹)

سیرت حلبیہ اردو کے مرتب لکھتے ہیں:

''یہ دراصل تصوف کی باتیں ہیں اور صوفیہ کے ہاں اس آیت پاک سے یہ معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ حقیقت میں (وثیابک فطہر) سے لباس اور کپڑے ہی مراد ہیں۔ فقہاء نے اس سے بدن پر پہنے جانے والے کپڑے ہی مراد لیے ہیں اور اس آیت سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ نماز میں بدن کے کپڑوں کا پاک ہونا ضروری ہے۔(۵۰)

حلبی رسول کریم ﷺ کی ولادت کے دن شکر کے اظہار کو مستحب قرار دیتے ہیں لیکن مرتب لکھتے ہیں:

''میلاد النبی کا منانا حقیقت میں ایک بدعت ہے جس کی کوئی اصل نہیں''۔(۵۱)

آپ ﷺ کی مدینہ آمد کے موقع پر بنی نجار کی خوشیاں منانے کا ذکر کرتے ہوئے حلبی کافی تفصیل سے صوفیہ کے سماع کے حق میں اقوال و روایات پیش کرتے ہیں، سیرت حلبیہ اردو کے مرتب نے اس موقع پر اپنا اختلاف وضاحت سے پیش کیا اور لکھا کہ:

''اس مخصوص موسیقی کے دور میں آنحضرت ﷺ کے ارشاد موجود ہیں، لہذا وہ خاص موسیقی ان روایات کے باوجود جائز قرار نہیں دی جاسکتی، جس کا سماع حرام ہے''۔(۵۲)

متصوفانہ عقائد کے قابل اعتراض ہونے پر ضروری نہیں کہ تمام اہل علم کا اتفاق ہو لیکن بعض اوقات وہ ایسے بیانات نقل کرتے ہیں جن کو مبنی بر حقیقت ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جیسے یہ کہ حجر اسود نے اپنی جگہ سے نکل کر چہل قدمی کی۔ چودہ کسان شیخ شعرانی کی ایک چپاتی سے سیر ہوئے اور شیخ شناوی کے دو آدمیوں کے کھانے سے سینکڑوں لوگوں کو کھلانے کی کرامات وغیرہ۔ (۵۳) بدء الوحی کی تفصیلات کے دوران صوفیہ کی اصطلاح ''حلول'' پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر

تھوڑا آگے جا کر ”مقام فنا“ کا تعارف کرایا گیا ہے۔غزوہ خندق کے آخر میں اولیاء کی کرامات بیان کی گئی ہیں۔(۵۴)

سیرت نگاری میں شافعی مسلک کی رعایت کرنا: اس مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ شافعی مسلک کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس سے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔ضمناً مسائل پر جب بحث کی تو شافعی مسلک کو ترجیح دی ہے۔اسی طرح امام شافعی کے فضائل کو تفصیل سے بیان کیا۔رسول کریم کے والد عبداللہ کے عوض سو اونٹ قربان کرنے کے ذکر پر وہ کہتے ہیں کہ ہم شافعیوں کے نزدیک یہ منت سرے سے باطل ہے۔نماز میں سورہ فاتحہ سے پہلے امام کے بلند آواز میں بسم اللہ پڑھنے کے حق میں امام شافعی کی رائے کو ترجیح دی۔ یہ بھی ذکر ہے کہ شافعی حضرات کے نزدیک محمد ﷺ نام افضل ہے۔(۵۵) اس لیے رسول اللہ ﷺ کا یہی نام افضل ہے۔ غرض سیرت حلبیہ میں شافعی مسلک کی جھلک زیادہ نمایاں ہے۔

معلومات کے مآخذ مبہم رکھنا: سیرت حلبیہ میں مذکور بعض مآخذ کا تعارف مشکل ہو جاتا ہے۔اس بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

۱۔حلبی بہت کم ایسی کتب کا ذکر کرتے ہیں جن کے مصنفین اور کتاب کے بارے میں دیگر معلومات حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔جیسے جلد اول کے صفحہ ۳۰ پر ”التشریفات فی الخصائص والمعجزات“ کا ذکر ہے۔جس کے بارے میں حلبی کہتے ہیں کہ مجھے خود اس کتاب کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔اسی جلد کے صفحہ ۱۱۲ پر ”کریم الندماء وندیم الکرماء“ اور اسی جلد کے صفحہ ۱۹۴ پر ”الفواصم عن الفتن القواصم“ کا ذکر ہے۔جن کا شافی تعارف حاصل نہیں ہوسکا۔

۲۔بعض اوقات حلبی کسی ایسے مصنف کے کلام یا قول کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کثیر التصانیف ہوتا ہے اور حلبی واضح نہیں کرتے کہ انہوں نے اس مصنف کی کون سی کتاب سے حوالہ دیا ہے۔اس طرح الذہبی کے اقوال اور روایات پر تنقید کے کافی حوالے سیرت حلبیہ میں ہیں مگر حلبی نے عموماً ان کی متعلقہ کتاب کا نام کے ساتھ ذکر نہیں کیا۔جلد اول کے صفحات ۱۲۰، ۱۰۶، ۱۰۵، ۵۷، ۵۴ وغیرہ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

ابن حزم کے متعدد اقوال سیرت حلبیہ میں مذکور ہیں۔اسی طرح عام طور پر فی کلام ابن العربی، فی کلام سبط ابن الجوزی، فی کلام الہیثمی یا قال ابن تیمیہ، قال الحافظ ابن حجر یا قال ابن کثیر وغیرہ کہہ کر حلبی آگے گزر جاتے ہیں اور متعلقہ کتاب کا ذکر نہیں کرتے۔

۳-بعض اوقات حلبی اس طرح حوالہ دیتے ہیں کہ وہ کہیں حوالہ معلوم نہیں ہوتا" والذی رایته فی بعض المجامیع "،" قد رایت عن بعض حواشی الکشاف "،" فی کلام بعض شراح الھمزیة "اور" ما فی بعض السیر عن الواقدی" جیسی عبارتوں میں بالترتیب خلیفہ منصور، ابن زبیر، چھینک کے مسائل اور مرحب کے قتل کی بات ہے لیکن یہ حوالے نہایت مبہم ہیں۔

اور بھی کثیر تعداد میں ایسے واقعات، اقوال اور روایات بھی ہیں جو بغیر ماخذ کے ہیں۔جیسے فتح مکہ، حجابہ اور سقایہ وغیرہ اور غزوہ طائف کے سلسلے میں مذکور واقعات میں سے کسی ماخذ کا بیان نہیں ہے۔سریہ عکاشہ، سریہ محمد بن مسلمہ، سریہ ابوعبیدہؓ بن جراح اور سریہ زید بن حارثہؓ، سریہ ابن ابی العوجاءؓ، سریہ غالب بن عبداللہؓ کے واقعات میں ماخذ کا ذکر نہیں ہے۔اسی طرح سریہ ابوقتادہؓ، سریہ خالد بن ولیدؓ، سریہ عمرو بن العاصؓ، سریہ سعد بن زیدؓ اور سریہ جذیمہؓ وغیرہ کے بھی بہت سے حالات ماخذ کے بغیر ہیں۔(۵۵) خصوصاً جلد سوم میں کہیں ماخذ کا ذکر ہے اور کہیں بالکل نہیں ہے۔

تنقیدی اور اختلافی کلام کا جائزہ لینے کے بعد مختصراً یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ:

۱-روایت لینے کا معیار کہیں کہیں بہتر نظر نہیں آتا۔۲-غیر متعلقہ معلومات شامل کتاب ہیں۔۳-بسا اوقات صحیح اور کمزور روایات بغیر وضاحت کے منقول ہیں۔۴-بعض استدلال قوی نہیں۔۵-ترتیب دلکش نہیں ہے۔۶-معلومات کی تکرار ہے۔۷-معلومات کئی دفعہ اصل ماخذ سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہوتیں۔۸-علمی اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔۹-سیرت نگاری میں مسائل تصوف کا اختلاط غیر ضروری ہے۔۱۰-شافعی مسلک کے اظہار پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

حوالہ جات

(۱) المحبی، محمد بن فضل اللہ "خلاصة الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر"، (دار صادر بیروت س ن

ن)، ص ۳/۲۳-۱۲۱-۱۲۱۔ (۲) www.alwarraq.com۔ (۳) قاسمی، محمد اسلم ''سیرت حلبیہ اردو'' (دار الاشاعت کراچی ۱۹۹۹ء)، ص ۲/۱۴۷۔ (۴) ایضاً ص ۱۵۰/۴۔ (۵) المطهری، شہید مرتضیٰ، ''النبی الامی'' مترجم نورالٰہی ''نقوش رسول نمبر''، مدیر محمد طفیل، ج ا، ش ۱۳۰، دسمبر ۱۹۸۲ء، ص ۵/۷۴۹۔ (۶) العمری، اکرم ضیاء ''السیرة النبویة الصحیحة''، (المکتبه العبیکان، الریاض)، ۱۹۹۸ء، ص ۱/۶۹۔ (۷) حلبی، علی بن برہان الدین، ''انسان العیون فی سیرة الامین المامون'' (المکتبۃ الاسلامیہ، بیروت ۱۳۲۰ھ)، ص ۱/۱۔ (۸) حلبی، ایضاً۔ (۹) حلبی، ایضاً ص ۳/۴۴۔ (۱۰) ابن الجوزی، ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی ''کتاب الموضوعات'' (المکتبۃ السلفیہ، المدینۃ المنورہ، ۱۹۶۶ء)، ص ۱/۳۵۷۔ (۱۱) حلبی، ''انسان العیون''، ص ۳/۴۷۔ (۱۲) ابن الجوزی، ''الموضوعات''، ص ۲/۸۱۔ (۱۳) حلبی، ''انسان العیون''، ص ۱/۳۰۔ (۱۴) ابن الجوزی، ''الموضوعات''، ص ۲/۲۸۱۔ (۱۵) حلبی، ''انسان العیون''، ص ۱/۲۸۔ (۱۶) الالبانی، محمد ناصر الدین ''الاحادیث الضعیفة والموضوعة'' حدیث نمبر ۲۱۰، (المکتبۃ الاثریۃ، سانگلہ ہل ۱۳۹۲ھ)، ص ۱/۱۸۹۔ (۱۷) حلبی، ''انسان العیون''، ص ۱/۲۵۱۔ (۱۸) قاسمی، محمد اسلم ''سیرت حلبیہ اردو''، ص ۲/۱۴۷۔ (۱۹) عنایت اللہ، ڈاکٹر شیخ ''رسول اکرم کے سیرت نگار'' نقوش رسول نمبر، مدیر محمد طفیل، ج ا، ش ۱۳۰، دسمبر ۱۹۸۲ء، ص ۵/۱۹۷۔ (۲۰) قاسمی، ''سیرت حلبیہ اردو''، ص ۳/۱۳۱۔ (۲۱) قاسمی، ایضاً ص ۱/۱۳۶۔ (۲۲) حلبی، ''انسان العیون''، ص ۱/۱۲۷، ۱۲۳، ۱۱۷، ۱۱۰، ۹۸، ۳۲، ۳۰۔ (۲۳) حلبی، ایضاً، ص ۲/۴۲، ۱۳۹۔ (۲۴) مرزا بشیر احمد ''سیرت خاتم النبیین''، (الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ ربوہ، س ن)، ص ۱/۲۳۔ (۲۴) حلبی ''انسان العیون''، ص ۳/۴۷، ۲۷۲۔ (۲۵) ایضاً ص ۲/۶۲۔ (۲۶) ایضاً۔ (۲۷) قاسمی ''سیرت حلبیہ اردو''، ص ۳/۱۶۶۔ (۲۸) حلبی ''انسان العیون''، ص ۱/۳۲۷۔ (۲۹) قاسمی ''سیرت حلبیہ اردو''، ص ۱/۱۳۱۔ (۳۰) حلبی ''انسان العیون''، ص ۱/۳۶۔ (۳۱) قاسمی ''سیرت حلبیہ اردو''، ص ۱/۱۶۰۔ (۳۲) حافظ ابن کثیر ''البدایہ والنہایہ''، ص ۲/۶۴-۲۶۳۔ (۳۴) حلبی ''انسان العیون''، ص ۳/۳۵۵۔ (۳۵) ایضاً ص ۱/۱۱۹۔ (۳۶) ابن ہشام، عبدالملک المعافری ''السیرة النبویة'' ذکر کفالة ابی طالب (مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ بمصر ۱۹۳۶ء)، ص ۱/۱۹۴۔ (۳۷) حلبی ''انسان العیون''، ص ۲/۱۸۔ (۳۸) ابن القیم، حافظ محمد بن ابی بکر الجوزی ''زاد المعاد فی ھدی خیر العباد'' ذکر البیعة الثانیه، (موسسۃ الرسالہ، بیروت ۱۹۹۶ء)، ص ۳/۴۳۔ (۳۹) حلبی ''انسان العیون''، ص ۱/۳۰۷۔ (۴۰) حافظ ابن حجر، احمد العسقلانی، ''الاصابة فی

تمییز الصحابة ''حرف الراء، (مکتبہ دارالفکر، بیروت ۲۰۰۱ء)، ص ۲/ ۱۹۶۔ (۴۱) حلبی ''انسان العیون''، ص ۱/ ۱۳۳۔ (۴۲) حافظ ابن حجر ''الاصابہ''، حرف الباء، ص ۲/ ۲۶۲۔ (۴۳) حلبی ''انسان العیون''، ص ۲/ ۲۷۷۔ (۴۴) ایضاً ص ۱/ ۱۲۷۔ (۴۵) قاسمی ''سیرت حلبیہ اردو''، ص ۱/ ۴۰۰۔ (۴۶) حلبی ''انسان العیون''، ص ۱/ ۱۴۲۔ (۴۷) قاسمی ''سیرت حلبیہ اردو''، ص ۱/ ۴۴۸۔ (۴۸) حلبی ''انسان العیون''، ص ۳/ ۲۰۰۔ (۴۹) ایضاً ص ۱/ ۲۶۳۔ (۵۰) قاسمی ''سیرت حلبیہ اردو''، ص ۲/ ۱۸۵۔ (۵۱) ایضاً ص ۱/ ۲۵۹۔ (۵۲) ایضاً ص ۳/ ۱۶۵۔ (۵۳) حلبی ''انسان العیون''، ص ۲/ ۳۳۰، ۱/ ۱۵۱۔ (۵۴) ایضاً ص ۲/ ۳۳۰، ۱/ ۵۵-۲۵۴۔ (۵۵) ایضاً ص ۱/ ۱۳۲، ۸۶، ۸۳، ۵۹، ۴۱۔ (۵۵) ایضاً ص ۳/ ۱۹۷-۱۹۵۔

فارم ۱۷ (رول نمبر ۸)

نام رسالہ: معارف، اعظم گڈھ

نام پریس:	معارف پریس اعظم گڈھ	نام پبلیشر:	عبدالمنان ہلالی
مقام اشاعت:	دارالمصنفین اعظم گڈھ	قومیت:	ہندوستانی
وقفۂ اشاعت:	ماہانہ	پتہ:	دارالمصنّفین اعظم گڈھ
نام پرنٹر:	عبدالمنان ہلالی	اڈیٹر:	اشتیاق احمد ظلی
قومیت:	ہندوستانی	قومیت:	ہندوستانی
پتہ:	دارالمصنّفین اعظم گڈھ	پتہ:	دارالمصنّفین اعظم گڈھ

نام و پتہ مالک رسالہ: دارالمصنّفین اعظم گڈھ

میں عبدالمنان ہلالی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

عبدالمنان ہلالی

امام شافعیؒ کے نزدیک قدیم وجدید کا مفہوم

جناب رشید الحسن صاحب
ترجمہ: پروفیسر مسعود الرحمٰن خان ندوی *

بعض فقہی مسائل میں دو رائیں یعنی ایک قدیم دوسری جدید دینے میں تمام فقہی مذاہب میں شافعی مذہب تقریباً منفرد ہے، اس لیے بعض مسائل میں فتوی قدیم رائے پر دیا جاتا ہے اور دیگر مسائل میں نئی رائے پر، اس بحث میں آگے بڑھنے سے پہلے شوافع کے نزدیک قول قدیم اور قول جدید کی اصطلاحوں اور ان کے وجود کے مظان کو بیان کرتا ہوں۔ شافعی فقہاء نے امام شافعیؒ کے اجتہادات کو قدیم اور جدید قسموں میں تقسیم کیا ہے اور ان کے معنی کے تعین میں دو قول پر اختلاف کیا ہے:

قول اول: قدیم قول وہ ہے جس کو امام شافعیؒ نے بغداد میں تصنیف یا املا یا افتاء میں کہا یا نص کیا خواہ اس سے رجوع کیا ہو (جو کہ غالب ہے) یا نہ کیا ہو۔ نوویؒ نے فرمایا: ان کے "قدیم" میں کہنے کا مطلب اس کتاب سے ہوتا ہے جو امام شافعیؒ نے بغداد میں تصنیف کی اور جس کا نام الحجہ تھا اور "جدید" میں کہنے کا مطلب اس قول سے ہوتا ہے جو امام شافعیؒ نے تصنیف یا املا یا افتاء کے ذریعہ پیش کیا۔ یہی بات مشہور ہے جیسا کہ المنہاج کے بیشتر شارحین مثلاً دمیری (وفات ۸۰۸ھ) محلی (وفات ۸۶۴ھ) اور خطیب شہربینی (وفات ۹۷۷ھ) نے کہا ہے، ان کے اس تعین سے قول کی جدت اور قدامت میں مقام کو اصل حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

قول ثانی: قدیم قول وہ ہے جس کو امام شافعیؒ نے مصر جانے سے پہلے کہا یا نص کیا اور جدید قول وہ ہے جس کو انہوں نے مصر پہنچنے کے بعد کہا یا نص کیا۔ یہ قول ابن حجر اور شمس رملی اور ان کے متاخر متبعین کا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تعریف اس لیے بہتر ہے کہ اس میں وہ سب شامل ہے جس کو امام شافعیؒ نے بغداد میں کہا اور جو ان سے مصر جانے کے راستہ میں منقول ہوا، اس میں مقام کا اعتبار نہیں بلکہ مصر میں داخل ہونے کے زمانہ کو اہمیت حاصل ہے۔

امام وخطیب وزارۃ اوقاف، کویت۔ * تاج المساجد، بھوپال۔

قول اول پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ بغداد و مصر کے راستہ میں امام شافعیؒ سے جو اقوال منقول ہوئے ہیں ان میں تقدیم وتاخیر کے تعین کی تلاش ضروری ہوگی، اس لیے کہ ان میں متاخر جدید ہوگا اور متقدم قدیم ہوگا۔ یہ رائے دقیق و منضبط نہیں ہے، امام شافعیؒ کے اقوال پر اس کی تطبیق مشکل ہے، اس رائے کے عدم انضباط کی وجہ دوسری رائے راجح معلوم ہوتی ہے، واللہ اعلم۔ لیکن دوسری رائے کے قائلین نے امام شافعیؒ کے ان اقوال کی طرف اشارہ نہیں کیا جو انہوں نے بغداد منتقل ہونے سے پہلے مکہ مکرمہ میں اپنا مسلک پیش کرتے ہوئے فرمائے تھے۔ ڈاکٹر لمین ناجی نے امام شافعیؒ کے قدیم وجدید اقوال کے استقراء اور فی الوقت دستیاب مصادر کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ ۱۸۶ھ میں مکہ مکرمہ میں اپنے مسلک کے استقلال کی ابتداء سے امام شافعیؒ کے تمام اقوال کو قدیم قول شامل ہے۔ اس بات کو اعتبار اس حقیقت سے بھی حاصل ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ نے الرسالۃ اور اپنی دیگر کتابیں مکہ مکرمہ میں تصنیف فرمائیں اور بغداد میں ان کا دوسالہ قیام اتنی مختصر مدت ہے کہ جو کتابیں تالیف کرنے اور ان کو پیش کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیے ضروری ہے کہ انہوں نے اپنی بعض کتابیں مکہ میں تالیف کی ہوں، اس لحاظ سے ان کے مکہ مکرمہ کے اقوال قدیم میں شمار ہوں گے، اور ان کے قدیم اقوال کے مسائل کے استقراء سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کے بعض اصحاب کی روایات کے مطابق ان میں سے بعض اقوال انہوں نے بغداد پہنچنے سے پہلے مکہ مکرمہ میں فرمائے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قدیم اقوال کی زمانی مدت ۱۸۶ھ سے مصر کے سفر ۲۰۰ھ تک پھیلی ہوئی ہے۔

قدیم وجدید اقوال کے مظانّ: قدیم اقوال کی نمائندہ کتاب الحجۃ تھی جس کو قدیم اقوال کے اہم ترین راوی حسن زعفرانی (وفات ۲۶۰ھ) نے نہ صرف روایت کیا تھا بلکہ اس کا مذکورہ نام بھی انہوں نے ہی رکھا تھا، قدیم اقوال سے بے توجہی کی وجہ سے یہ کتاب مفقود کے حکم میں ہے، اس لیے امام شافعیؒ کے قدیم اقوال متقدم مصادر کی طرف رجوع کے بغیر نہیں معلوم ہوسکتے جیسے ابن القاص (وفات ۳۳۵ھ) کی التلخیص، قفال شاشی (وفات ۴۰۰ھ) کی التقریب، اور سہل بن عفریس زوزنی (وفات ۳۶۲ھ) کی جمع الجوامع، ماوردی (وفات ۴۵۰ھ) کی الحاوی، امام حرمین (وفات ۴۷۸ھ) کی نہایۃ المطلب یا متاخر مصادر میں رافعی کی فتح العزیز اور نووی کی المجموع۔ قول قدیم کے عظیم ترین راویوں میں امام شافعیؒ کے چار اصحاب ہیں: احمد بن حنبل، ابوثور، زعفرانی اور کرابیسی۔

جدید اقوال کی نمائندہ کتاب الام ہے جو ربیع مرادی (وفات ۲۷۰ھ) کے جمع کردہ املاءات سے عبارت ہے، اور انہوں نے ہی اس کتاب کو مذکورہ نام یہ بتانے کے لیے دیا کہ یہ کتاب ان کی روایت کردہ امام شافعی کی فقہی تصنیفات کی جامع ہے، اس میں کئی کتابیں ہیں: فروع کی بھی اور اصول کی الرسالۃ اور فقہ مقارن کی اختلاف مالک واختلاف ابی حنیفۃ اور آیات احکام کی تفسیر کی اور احادیث احکام اور آثار کی۔ امام شافعیؒ کی جدید نصوص کی معرفت کے لیے کتاب الام اہم مراجع میں سے ہے مگر شافعی فقہاء نے اس کی شرح یا اختصار یا تعلیق کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی، ان کی تمام توجہ مزنی کی مختصر پر مرکوز رہی، یہ پہلو بحث وتحقیق کا مستحق ہے۔

نووی نے کہا: امام شافعیؒ نے اپنی تمام نئی کتابیں مصر میں تصنیف کیں اور ربیع نے کہا: امام شافعیؒ نے مصر میں چار برس قیام کیا ڈیڑھ ہزار ورق املاء کرائے، دو ہزار ورق میں کتاب الام تصنیف کی اور کتاب السنن وغیرہ اور یہ سب صرف چار برس کی مدت میں۔ شافعی مذہب کے راوی بہت سے ہیں، ان میں جلیل ترین بویطی، مزنی، ربیع مرادی، حرملہ، یونس بن عبدالاعلی ہیں۔ ان میں سے اولین تین نے اس مذہب کا بیڑہ اٹھایا اور اس کی خوب ترویج کی، جبکہ باقی دو سے تفاوت کے ساتھ محدود چیزیں منقول ہیں۔

اب اہم سوال یہ ہے کہ کیا قدیم مرجوح ہے جس پر عمل نہیں ہوگا؟ یا وہ امام شافعیؒ کا مذہب شمار ہوگا اور اس پر عمل بھی ہوگا؟ امام شافعیؒ کے اصحاب کا اس بارے میں کیا موقف ہے؟ اور کیا امام شافعیؒ بغیر استثناء اپنے پورے مذہب سے منحرف ہوگئے تھے یا نہیں؟ اور کیوں؟ ہر سوال کا الگ الگ جواب درج ذیل ہے:

کیا قول قدیم مرجوع ہے جس پر عمل نہیں ہوگا؟ اس کے جواب کے لیے قدیم اقوال کی تین حالتوں کا بیان ضروری ہے:

اول حالت: نئے قول میں قدیم کے خلاف نص ہو، شافعی فقہاء میں یہ اختلافی مسئلہ ہے، جمہور کے نزدیک وہ مرجوع عنہ ہے اور اس پر فتوی نہیں ہے، نہ اس پر عمل کیا جائے گا، نہ وہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے، نووی نے امام الحرمین سے روایت کی ہے: میرا اعتقاد ہے کہ قدیم اقوال امام شافعی کا مذہب نہیں، اس لیے کہ جدید قول میں انہوں نے اس کے خلاف یقینی بات کہی ہے، اور مرجوع عنہ راجع کا مذہب نہیں ہوتا۔ مگر بعض شافعی فقہاء کا خیال ہے کہ قدیم اقوال مرجوع عنہ

شمار نہیں ہوں گے، نووی نے کہا کہ ”ہمارے بعض اصحاب کہتے ہیں: جب مجتہد اپنے قول کے خلاف بات کہے تو وہ پہلے قول سے رجوع نہیں بلکہ دو قول شمار ہوں گے“۔ لیکن نووی نے اس رائے پر یہ کہا: یہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ دو قول شارع کی دو نص کی طرح ہیں، تعارض اور ان دونوں کے درمیان عدم جمع کی صورت میں دوسرے قول پر عمل کیا جائے گا اور پہلے قول کو چھوڑ دیا جائے گا۔

دوسری حالت: جدید قول میں قدیم کے خلاف نص نہ ہو، قدیم کا ذکر ہی نہیں کیا ہو بلکہ اس سے سکوت اختیار کیا ہو تو اس پر فتویٰ دیا جائے گا، اس پر عمل ہوگا اور وہ امام شافعیؒ کا مذہب شمار ہوگا۔ نووی نے کہا: یہ کہنا کہ قدیم قول امام شافعیؒ کا مذہب نہیں ہے یا مرجوع عنہ ہے یا اس پر فتویٰ نہیں ہے کا مطلب یہ ہے کہ جب اس قدیم قول کے خلاف جدید قول میں نص ہو، مگر جس قدیم قول کے مخالفت جدید قول میں نہ ہو اور جدید قول میں قدیم کا ذکر ہی نہ ہو تو وہ امام شافعیؒ کا مذہب واعتقاد شمار ہوگا، اس پر عمل کیا جائے، اس پر فتویٰ دیا جائے گا، اس نوع کے بہت سے مسائل ہیں۔

تیسری حالت: قدیم قول کی صحیح حدیث مددگار ہو، مخالف نہ ہو تو اس کو بھی امام شافعیؒ کا مذہب شمار کیا جائے گا، اس پر عمل ہوگا اور اس پر فتویٰ دیا جائے گا۔ رازی نے حرملہ بن یحییٰ کی سند سے امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے: جو کچھ میں نے کہا اگر اس کے خلاف نبی ﷺ کی صحیح حدیث ہو تو نبی ﷺ کی حدیث اولیٰ و برتر ہے، ایسی صورت میں میری تقلید نہیں کرنا۔ نووی نے کہا یہی امام شافعی کا مذہب ہے، جدید قول میں یہ نصاً اوپر کی تمام بحث اس قدیم قول کے بارے میں ہے جس کو صحیح حدیث سے تقویت نہ مل رہی ہو لیکن وہ قدیم قول جس کی صحیح حدیث سے تقویت ہو رہی ہو اور وہ اس کے مخالف نہ ہو تو وہی امام شافعیؒ کی طرف منسوب مذہب ہے۔ حقیقتاً اسی بات کی وجہ سے جب بعض شافعی فقہاء نے امام شافعیؒ کے قول کے خلاف کوئی صحیح حدیث دیکھی تو کہا حدیث کی رو سے امام شافعیؒ کا مذہب اس طرح ہے لیکن یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ یہ بات ہر فقیہ کے بس میں نہیں ہے، اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ امام شافعیؒ کے قول کے خلاف کوئی صحیح حدیث ہو اور وہ ان کو معلوم بھی ہو مگر اس کے بارے میں ان کی کوئی متعین تاویل ہو یا ان کے پاس اس حدیث کے خلاف اس سے زیادہ قوی سند اور صریح دلالت والی یا اس کو مقید یا مخصص کرنے والی یا قطعی قواعد شریعت کے خلاف کوئی حدیث ہو جس کی وجہ سے ان کے نزدیک اس حدیث پر عمل متروک ہو، اس لیے اگر کسی کو امام شافعیؒ کے کسی قول کے خلاف کوئی حدیث ملے تو اس کے

لیے یہ کہنا جائز نہیں ہے "یہ امام شافعی کا قول ہے" مگر یہ کہ وہ مذہب کی کتابوں کا استقصاء کرکے مکمل تلاش وتحقیق کرلے کہ کیا ان کو یہ حدیث پہنچی تھی کہ نہیں؟ اگر پہنچی تھی تو اس پر عمل ترک کرنے کے کیا اسباب تھے؟ اس کے بعد ہی وہ کسی حدیث کے مطابق مذہب امام شافعیؒ کی طرف منسوب کرسکتا ہے۔

مجتہد شافعی فقہاء نے چند مسائل کو امام شافعیؒ کے قدیم قول پر فتوی کے لیے الگ کیا ہے اس لیے کہ ان کو غالب ظن تھا کہ امام شافعی کو یا تو قدیم قول کی تقویت پہنچانے والی حدیث کا علم نہ ہوا یا اس کی صحت معلوم نہ ہوئی۔ ان مسائل کے تعین میں فقہاء کے درمیان اختلاف کی وجہ سے ان کی تعداد تین سے بیس تک یا زیادہ ہے۔ نووی نے کہا ہر وہ مسئلہ جس میں امام شافعی کے قدیم وجدید دو قول ہوں تو جدید قول صحیح ہے اور اسی پر عمل ہونا چاہیے، اس لیے کہ قدیم مرجوع عنہ ہے اور ہمارے شوافع اصحاب نے ان میں سے بیس یا اس سے زیادہ مسائل کو مستثنیٰ کیا ہے جن کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ قدیم قول پر فتوی دیا جائے گا۔ اور علامہ محمد امین کردیؒ کا کہنا ہے "اگر ہمارے شافعی ائمہ کے کلام کا تتبع کیا جائے تو ایسے مسائل تیس سے بہت زیادہ ہوں گے، اس لیے کہ صرف نجاست سے متعلق میں نے ان دو مسئلوں کا اضافہ کیا ہے تو اگر تمام ابواب فقہ کا تتبع کیا جائے تو کتنی تعداد ہوگی!"۔

اب سوال اٹھتا ہے کہ یہ مستثنیٰ مسائل امام شافعیؒ سے منسوب ہوں گے یا نہیں؟ اس کے جواب میں نوویؒ نے کہا "پھر ہمارے شافعی اصحاب نے ان مسائل میں قدیم قول پر فتوی دیا، حالانکہ امام شافعیؒ اس سے رجوع کرچکے تھے، اس لیے وہ ان کا مذہب نہیں رہا تھا، ہم اس کو اس بات پر محمول کرتے ہیں کہ دلیل ظاہر ہونے کی وجہ سے ان کے اجتہاد نے ان کو قدیم قول کا قائل کیا تو انہوں نے قدیم قول پر فتوی دیا، اس بات سے اس قول کی امام شافعیؒ کی طرف نسبت لازم نہیں ہوتی، نہ ان مسائل کے ناقدین میں سے کسی نے کہا کہ وہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے یا یہ کہ اس نے ان کا استثناء کیا ہے"۔ اس لیے جو شخص تخریج واجتہاد کا اہل نہ ہو اس پر جدید قول کی اتباع لازم ہے اور جو اس کا اہل ہو اس پر دلیل کے مطابق عمل اور فتوی لازم ہے یہ بتاتے ہوئے کہ یہ اس کی اپنی رائے ہے اور امام شافعیؒ کا مذہب الگ ہے۔

ایک بڑا سوال یہ ہے کہ مصر آنے کے بعد امام شافعیؒ نے کیا اپنے پورے مذہب سے انحراف کیا تھا یا نہیں؟ اور کیوں؟ دقیقہ رسی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ امام شافعیؒ کا مذہب ایک ہی ہے اور جدید قول قدیم قول کا امتداد وتوسیع ہے اور نئی کتابیں پرانی کتب کی تحقیق وتمحیص ہیں اور

کتاب الحجۃ ہی کتاب الام ہے،ان دونوں کتابوں کا یہ نام امام شافعیؒ نے نہیں بلکہ ان کے راویوں نے رکھا ہے،امام شافعیؒ نے تو اپنی قدیم کتاب میں حذف واضافہ اور تعدیل وترمیم کی ہے، اس لیے کہ امام شافعیؒ جس طرح دوسروں کی آراء کی تحقیق وتفتیش کرتے تھے اپنی آراء پر بھی نظر ثانی کرتے تھے،اب وہ آراء باقی رہیں یا بدلیں،یہ باحثین ومحققین کے فکر واجتہاد کی بات ہے۔

بیہقی (وفات ۴۵۸ھ) مناقب الشافعی میں اس بارے میں لکھتے ہیں: پھر امام شافعیؒ نے جدید مذہب کے مطابق از سرنو ان کتب کو لکھا اور متعدد کتابوں میں تبدیلی کی،جیسے کتاب الصیام، کتاب الصداق، کتاب الحدود، کتاب الرھن الصغیر، کتاب الاجارۃ، کتاب الجنائز وغیرہ،وہ جدید مذہب میں ان کتب کو پڑھوا کر سنتے،جن مسائل میں ان کی رائے بدل جاتی ان کو ضائع کردیتے اور کبھی دوسری جگہ ذکر پر اکتفاء کرتے ہوئے ان کو چھوڑ دیتے تھے۔اس طرح امام شافعیؒ اپنی قدیم کتب پر برابر نظر ثانی کرکے ان میں حذف واضافہ فرماتے،اس لیے اصل مذہب ایک ہی ہے۔میری بات کی تائید الفہرست میں المبسوط کے ذکر کے وقت ابن ندیم (وفات ۴۳۸ھ) کی اس بات سے ہوتی ہے: زعفرانی نے المبسوط کو امام ربیع کی ترتیب کے مطابق امام شافعیؒ سے روایت کیا،اس میں تھوڑا سا اختلاف ہے،لوگ اس کی طرف راغب ہیں، نہ اس پر عمل کرتے ہیں، الربیع کی روایت کے مطابق اس پر صرف فقہاء عمل کرتے ہیں،اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی اصل ایک ہے اور وہ اسی ترتیب سے ہے (جس پر اول کتاب تھی)۔

اس بات کی تصدیق ڈاکٹر لمین ناجی نے بھی اپنے عمدہ رسالہ القدیم والجدید فی فقہ الشافعی میں یہ کہتے ہوئے کی ہے: جس اصول پر امام شافعیؒ نے اپنی قدیم فقہ ترتیب دی اسی پر انہوں نے جدید فقہ بھی تعمیر کی، بلکہ فقہ جدید قدیم فقہ ہی کی توسیع ہے،اسی کے دائرہ میں داخل ہے اور اسی کے اصول پر چلتی ہے۔انہوں نے یہ بھی کہا ہے قدیم وجدید میں کوئی ایسا خاص امتیاز نہیں جو ان کو شافعی فقہ کے عام ظاہرہ سے جدا کرے اور اگر مصر کے علاوہ کسی اور جگہ جانا ان کے مقدر میں ہوتا تو بھی وہ یقینی طور پر بہت سے اقوال سے رجوع کرتے۔

شیخ محمد بن عمر الکاف اپنی کتاب المعتمد عند الشافعیۃ میں لکھتے ہیں امام شافعیؒ کی تاریخ بیان کرنے والوں کی بہت سی عبارتوں سے وہم ہوتا کہ جدید وقدیم اقوال دو مستقل

بالذات مذہب ہیں اور امام شافعیؒ نے جدید کتابیں قدیم کتابوں سے بالکل الگ املا کرائی ہیں بعض اہل قلم نے مصر میں امام شافعیؒ کے چار سالہ قیام کو نئے مذہب کی تاسیس اور نئی کتب کی تصنیف کے لیے ناکافی سمجھا لیکن باریک بینی سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حقیقت میں شافعیؒ مذہب ایک ہی ہے اور جدید قول قدیم قول کا امتداد اور توسیع وترقی ہے۔

اس باب میں امام شافعیؒ مجتہدین میں تنہا اور نئے نہیں ہیں، چنانچہ باقی تینوں ائمہ ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ اور ان کے علاوہ بہت سے دیگر علماء کی متعین رائے ہوتی تھی مگر جب کسی اثر یا غور وفکر سے ان کے نزدیک اس رائے کے خلاف بات ثابت ہوتی تھی تو وہ پہلی رائے سے رجوع کر لیتے تھے، ایسا بہت ہوتا ہے کہ مذہب کے راوی اپنے اماموں سے ایک مسئلہ میں دو یا زیادہ قول نقل کرتے ہیں تو بے علم لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ مذہب کا تعدد نقص کا موجب ہے، حالانکہ اس سے تو مقام ومرتبہ میں اضافہ ہوتا، اس لیے کہ یہ بات اللہ کے دین کے بارے میں شدت تقوی واحتیاط اور اپنی رائے کے لیے تعصب ترک کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ قدیم اقوال سے امام شافعیؒ نے کیوں رجوع فرمایا؟ جواب یہ ہے کہ اگرچہ بہت سے اہل علم میں یہ بات مشہور ہے کہ امام شافعیؒ نے مصر جا کر جب وہاں عادات واعراف کا اختلاف دیکھا تو وہ قدیم مذہب سے جدید مذہب کی طرف رجوع ہوئے مگر یہ رائے فعلاً واقعہ کے خلاف ہے، اگر یہ بات صحیح ہوتی تو عراق میں امام شافعیؒ کے اصحاب اپنے قدیم مذہب پر جمے رہتے، اس لیے کہ وہ ان کے ملک کے لیے زیادہ مناسب تھا مگر ایسا نہیں۔

جن شافعی فقہاء نے قدیم قول کو جدید قول سے زیادہ راجح مانا ہے ان کا یہ خیال بھی قدیم قول کی دلیل کے رجحان کی بنیاد پر ہے نہ کہ عراقی ہونے کی وجہ سے۔ امام احمد بن حنبلؒ سے سوال کیا گیا کہ عراقیوں کے پاس امام شافعیؒ کی جو کتابیں ہیں وہ آپ کو زیادہ پسند ہیں یا جو کتابیں اہل مصر کے پاس ہیں؟ جو کتابیں انہوں نے مصر میں لکھی ہیں تم ان کو لازم پکڑو، اس لیے کہ انہوں نے یہ کتابیں اگرچہ عراق میں لکھی تھیں لیکن ان کو مستند نہیں کیا تھا، یہ کام انہوں نے مصر آ کر کیا۔ عمرو بن سواد السرحیؒ کہتے ہیں مجھ سے امام شافعیؒ نے کہا تم میری کتابیں کیوں نہیں لکھتے؟ میں خاموش رہا تو ایک آدمی نے ان سے کہا، اس کا خیال ہے کہ آپ نے لکھا، پھر بدلا، پھر لکھا،

پھر بدلا، امام شافعیؒ بولے اب فیصلہ کا وقت آ گیا۔ ان کا مطلب تھا کہ اب معاملہ کو واضح کرنے کا وقت آ گیا، کیونکہ مجتہد کے نزدیک دلیل صحیح ثابت ہونے پر عمل واجب ہو جاتا ہے اور جب حکم اول کے خلاف زیادہ قوی دلیل مل جاتی ہے تو حکم ثانی کی طرف رجوع واجب ہو جاتا ہے۔

امام شافعیؒ کے قدیم اقوال سے عدول ورجوع کے اسباب جاننے کے لیے پہلے درج ذیل امور کی واقفیت ضروری ہے:

امام شافعیؒ کی زندگی طلب علم کے لیے کثرت رحلات واسفار میں ممتاز تھی، ہر ملک میں مسائل کو دیکھنے کے زاویے مختلف تھے ان کا عراق کا سفر سود مند تھا مگر مصر کا سفر بھی اس سے کم لیکن فضل سابق کو حاصل ہوتا ہے۔

امام شافعیؒ کو وہ مواقع حاصل ہوئے جو دیگر ائمہ مذاہب کو نہ مل سکے، چنانچہ امام شافعیؒ نے اپنے مذہب کے اصول مدون کیے اور استنباط احکام کے قواعد وضابطے بیان کیے۔

امام شافعیؒ کو بہت سی ایسی احادیث وآثار کا علم ہوا جو دوسروں کو نہیں تھا، یہ بڑا طاقتور سبب ہے، اس لیے کہ کسی عالم کی دیگر نصوص کی معرفت اس کو کسی ایک قول کے معارضہ یا ترجیح یا نسخ یا تخصیص یا تقیید وغیرہ کا فائدہ پہنچاتی ہے۔

عمر میں برکت اور اسفار کی کثرت نے بے شمار علماء سے ملاقات کی فرصت دی اور اس سے تجربات میں فائدہ ہوا۔

مجتہدین کے ماحول واحوال کے اختلاف کا علم اور ان کے حل کے طریقوں سے واقفیت۔

فکری پختگی جو غور وفکر کی کثرت اور مسلسل اطلاع ومعرفت سے حاصل ہوتی ہے، بقول شیخ محمد ابوزہرہ امام شافعیؒ نے اپنی تمام آراء اور اصولوں کا ایک ناقد، حقیقت کے متلاشی اور ان کو آشکارا کرنے والے کی حیثیت سے مطالعہ ومذاکرہ کیا۔

امام شافعیؒ دلائل کے قائل اور جویا تھے، مزاج نقد وبحث کا تھا، اسی لیے وہ اپنے ہم عصر علماء وتلامذہ کے ساتھ ہمیشہ مناظرہ میں مشغول رہتے تھے، اس لیے کسی رائے کو قائم کرنے اور پھر اس سے رجوع کرنے میں ان کا ذہن کھلا رہتا تھا۔

ان کے اساتذہ کا تنوع مکہ مکرمہ کے مسلم زنجی، مدینہ منورہ کے امام مالکؒ، عراق کے محمد

بن الحسنؒ میں ہر ایک کا اپنا الگ مشرب ومنہج تھا۔

آراء میں اصولی تغیر وتبدل، چنانچہ اصول فقہ کے بعض شافعی علماء نے ایسے اقوال کی نشان دہی کی ہے جن میں قدیم سے جدید تک امام شافعیؒ کی رائے میں اختلاف ہے جیسے صحابی کے قول کی حجیت، مرسل حدیث کی حجیت وغیرہ۔

امام شافعیؒ کے نزدیک ان کے اساتذہ میں کوئی امام مالکؒ کی طرح عظیم نہیں تھا، ان کے بعد سفیان بن عیینہ کا نمبر تھا، وہ فرمایا کرتے تھے، امام مالکؒ سے زیادہ میرے اوپر کسی کا احسان نہیں ہے، ان ہی سے میں نے علم حاصل کیا ہے۔ کہا جاتا ہے قدیم میں امام شافعیؒ امام مالکؒ کے متبع نہیں تھے مگر اس کی امام نوویؒ نے تردید کی ہے۔ اقوال میں مبالغہ ممکن ہے بغداد میں امام شافعیؒ مجتہد مطلق تھے، مگر امام مالکؒ کی مخالفت کی صراحت بھی نہیں ملتی۔

جب ان کو معلوم ہوا کہ بعض اسلامی ممالک میں امام مالکؒ کے آثار وباقیات اور کپڑوں وغیرہ کو مقدس سمجھا جاتا ہے اور اس کے لیے امام مالکؒ کے کسی قول سے تائید بھی کی جاتی ہے تو امام شافعیؒ ناراض ہوئے اور امام مالکؒ کی رایوں کی تحقیق وتنقید کر کے صحیح کو واضح کیا تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ امام مالکؒ بھی ایک انسان ہیں جو صحیح اور غلط ہو سکتے ہیں اور حدیث کے سامنے ان کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں ہے، پھر خلاف مالک نامی ایک کتاب لکھی لیکن استاد کے احترام میں اس کے اعلان میں ان کو تردد رہا۔

امام مالکؒ کے علاوہ وہ عراقیوں (احناف) کے متعلق یہی فریضہ انجام دے، پھر مصر میں مالکیہ پر تنقید بھی اسی عمل کا حصہ ہے، وجہ ان کے الفاظ میں یہ تھی کہ "جب میں مصر آیا تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ امام مالک سولہ احادیث کے علاوہ اپنی احادیث کی مخالفت کرتے ہیں، میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ اصل کی بات کرتے ہیں تو فرع کو چھوڑ دیتے ہیں اور فرع کی بات کرتے ہیں تو اصل کو چھوڑ دیتے ہیں" ۔ربیع مرادی نے کہا: مصر آنے سے پہلے مجھ سے امام شافعیؒ نے اہل مصر کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا وہ دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، ایک امام مالکؒ کے قول کی طرف مائل ہے اور ان کا دفاع کرتا ہے، اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کا گروہ بھی ہے۔ اس پر امام شافعیؒ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ انشاءاللہ مصر جاؤں گا تو ان دونوں اقوال سے بے نیاز کرنے والی چیز ان کے سامنے پیش کروں گا۔

مصر میں امام شافعیؒ کی مدت قیام چار برس کے قریب تھے، وہ مصر ۱۹۹ھ یا ۲۰۰ھ میں تشریف لائے اور ۲۰۴ھ میں وفات ہوگئی۔ مصر میں قیام کی کئی وجہیں ہیں:

بعض نے کہا کہ عباسی والی مصر العباس بن عبداللہ کی مصاحبت سبب تھی۔

ایک قول یہ ہے کہ مامون کی خلافت کے زمانہ میں عربی عنصر پر فارسی عنصر کے غلبہ اور خلیفہ معتزلہ و متکلمین کی قربت اقتصادی حالات کی خرابی کا سبب تھی۔

بعض نے کہا صاحب صلاحیت تلامذہ کی تلاش سبب تھی تاکہ وہ ان سے علم حاصل کریں۔

حقیقت جو بھی ہو امام شافعیؒ نے اپنے قدیم اقوال سے قابل یقین اسباب کی وجہ سے رجوع کیا، اس کے سبب سے نہیں کہ انہوں نے مصر میں نئی تہذیب و تمدن کا مشاہدہ کیا کیونکہ عراق اور مصر کے درمیان اتنا بڑا فرق نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے مسائل میں بڑے پیمانہ پر رجوع کی نوبت آئے، شوافع نے اس سبب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ نوویؒ نے مسائل کے ذکر میں کہیں اس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا، صحیح یہی ہے کہ امام شافعیؒ کی آراء میں تبدیلی قدیم کے ضعف اور جدید کی صحت کے سبب ہے اور اختلاف کی وجہ اپنے مسلک کو دلائل سے مستحکم کرنا ہے، امام احمد بن حنبلؒ نے یہ تو کہا ''تم ان کتابوں کو لازم پکڑو جن کو انہوں نے مصر میں مکمل کیا ہے، انہوں نے ان کو اگرچہ عراق میں لکھا تھا لیکن وہاں ان کو مدلل و مستند کرنا باقی تھا'' اگر ماحول و معاشرہ کی تبدیلی سبب ہوتا تو ابن حنبلؒ اس کو بھی بیان فرماتے۔

بعض محققین نے قدیم اقوال سے رجوع کا سبب لیث بن سعد (وفات ۱۷۵ھ) کی فقہ سے تاثر اور امام کے نامور تلامذہ جیسے اشہب بن عبدالعزیز وغیرہ سے استفادہ کو مانا ہے، یہ بھی کمزور دلیل ہے، کیونکہ امام شافعیؒ نے اپنی کتابوں میں لیث بن سعد کا حوالہ دیا ہے نہ ان کے شاگردوں کا، گو یہ بات بعید نہیں کہ امام شافعیؒ نے کچھ مسائل لیث بن سعد کی فقہ سے لیے ہوں، اس لیے کہ وہ لیث اور ان کی فقہ کو بلند مقام دیتے تھے اور ان سے عدم ملاقات اور علم حاصل نہ کرنے پر افسوس کا اظہار کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے فرمایا ہے ''میرے اوپر ابن ابی ذئب اور لیث بن سعد کی وفات دیگر کسی عالم کی موت سے زیادہ گراں گذری''۔

(ماہنامہ الوعی الاسلامی، کویت، شمارہ نمبر ۵۴۲، شوال ۱۴۳۱ھ / ستمبر - اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص ۳۸-۴۳)

مراجع و مصادر اصل عربی مضمون میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

روداد چند اہم سمینار

بین الاقوامی قرآن مجید سمینار معہد العالی الاسلامی حیدر آباد

حافظ عمیر الصدیق ندوی دریابادی

حیدر آباد دکن کی لطیف و دلکشا آب و ہوا اور اس کے فرخندہ جا ہونے میں اس کے بنیاد گزار محمد قلی قطب شاہ کو یقین تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ یہ شہر منزلاً مبارکاً کا مصداق ہے، خدا جانے یہ کیسا یقین تھا کہ آج بھی جب کہ قطب شاہی رہی نہ آصف جاہی، یہ شہر اسی یقین کا خوبصورت ترین اظہار ہے، ماضی میں اس کی مذہبی و علمی و ادبی روایات اگر قابل فخر ہیں تو اس کا حال ان روایات کی پاس داری جس طرح کر رہا ہے وہ بھی قابل شکر ہے اور اس کی تازہ مثال ۶ - ۸ر فروری ۲۰۱۱ تک ہونے والا وہ مذاکرہ علمی ہے جس کا موضوع قرآن مجید اور اس کی تعلیمات تھا، مقصد یہ تھا کہ قرآنی تعلیمات کی آفاقیت اور انسانی ضرورت و مصلحت سے ہم آہنگی سے ازسرنو دنیا کو واقف کرایا جائے کہ موجودہ عصر اس کا سب سے زیادہ مستحق و ضرورت مند ہے کیونکہ موجودہ ترقیوں نے قرآن مجید کی رہنمائی کی اہمیت کو اور سوا کر دیا ہے، اس کے لیے قرآن مجید کی موثر تدریس اور ترسیل ناگزیر ہے، حیدر آباد میں مذہبی اور علمی ادارے کم نہیں اور یہ اپنے مقاصد کے لیے سرگرم عمل بھی ہیں ان میں ادارہ المعہد العالمی الاسلامی غالباً سب سے حدیث العہد ہے، اس کی عمر صرف دس سال کی ہے لیکن اپنے فعال، دردمند اور ہوش مند بانی جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی قیادت میں اس نے فکر و عمل کی راہوں کو جس خوبی اور سلیقے سے روشن کیا ہے، اس کی مثال کم ہی ملے گی، عجیب بات ہے کہ حیدر آباد کو فرخندہ بنیاد کہا گیا اور اس ادارے کی تاریخ تاسیس بھی یوں نکالی گئی کہ یہ دانش کدہ فرخندہ بنیاد ہے، تاسیس کا اصل مقصد مدارس دینیہ و عربیہ کے فارغین طلبہ کو دین اور علم دین
۱۴۲۰ھ
کی خدمت کے لیے صحیح خطوط پر تربیت دینا اور تیار کرنا تھا، یہ وقت کی اہم ضرورت تھی، دس سال پورے ہوئے تو جائزے اور تجزیے کی ایک فرصت ملی اور اس سے بہتر کیا طریقہ تھا کہ موجودہ عالمی حالات میں

قرآن مجید سے عناد و عداوت کی لہروں کے مد و جزر کا جائزہ اس احساس سے لیا جائے کہ یہ صرف قرآن دشمنی نہیں ہے بلکہ خدا بیزاری اور مذہبی و اخلاقی قدروں سے کامل بے تعلقی اور بے مہار آزادی کا اظہار ہے، موضوع کی اہمیت تھی کہ اس مذاکرہ علمی کو ملک کی مقتدر ترین شخصیتوں کی تائید حاصل ہوئی، مولانا سید محمد رابع ندوی، مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا سعید الرحمن اعظمی، مولانا سید نظام الدین، مولانا سید ارشد مدنی، مولانا فضیل الرحمن عثمانی، مولانا مفتی اشرف علی باقوی، مولانا محمد ولی رحمانی جیسے مشاہیر علمائے ہند کے علاوہ مدینہ منورہ کے محدث کبیر شیخ محمد عوامہ، ڈاکٹر محی الدین محمد عوامہ اور ڈاکٹر عبدالالہ اور برطانیہ کے مولانا محمد عیسی منصوری کی شرکت کی منظوری ملی، مولانا سید محمد رابع ندوی عین وقت علالت کی وجہ سے شریک نہیں ہوسکے اور مولانا محمد سالم قاسمی اچانک معذور ہوگئے، ان کا خطبہ افتتاحیہ ان کے صاحبزادے مولانا محمد سفیان قاسمی نے پیش کیا، مذاکرے کے لیے عنوانات بہت پہلے تجویز کردیے گئے تھے، اس لیے تکرار کی جگہ تنوع نے اس کو اور مفید بنادیا، تاریخ، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، نفسیات، فلکیات، ماحولیات، شبہات، اعتراضات، استشراق، عصری افکار، انسانی تعلقات، تراجم، معلومات، جدید وسائل اور ذرائع ابلاغ غرض ہر موضوع پر قرآن مجید کے تعلق سے معلومات کے ساتھ شعور کی سیرابی و بیداری کا ایک خزانہ فراہم کردیا گیا اور عملاً یہ حقیقت سامنے لائی گئی کہ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کے عجائب لامتناہی اور لازوال ہیں، مثالی تہذیب انسانی کی بنیاد صرف قرآن مجید ہی سے ممکن ہے، عصر حاضر کے مسائل خواہ کتنے ہی سنگین ہوں ان کا حل صرف قرآن مجید میں ہے، یہ قرآن مجید کی خدمت کا جذبہ تھا کہ اس سعادت کے حصول میں شرکاء کی تعداد عام سمیناروں سے کہیں زیادہ تھی اور خوشی کی بات ہے کہ بڑوں کے ساتھ نوجوان اہل فکر و قلم کی تعداد کم نہیں تھی اور ان میں قدرتی طور پر ان نوجوان فضلاء کی اکثریت تھی جن کا تعلق المعہد العالی الاسلامی سے ہے یا رہا ہے، بالاستیعاب اسماء نویسی کی یہاں گنجائش نہیں لیکن ان کی تحریروں سے صاف ظاہر تھا کہ محنت رائیگاں نہیں گئی بلکہ یہ امید قوی ہوگئی کہ کشت ویراں کا شکوہ نہیں رہے گا، افتتاحی اجلاس بظاہر یہ شکوہ تھا لیکن جب معہد کے فارغین کی قلمی کاوشیں سامنے آئیں اور ان کے اجراء کی رسم انجام دی جانے لگی تو سطوت و شوکت کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔ بیسیوں کتابیں تھیں جن کے مولف و مصنف سب کے سب نو دمیدہ لیکن موضوعات و شمولات سارے کے سارے متین و سنجیدہ، معہد کی دس سالہ زندگی کے متعلق تلك عشرة كاملة سے زیادہ بہتر تعبیر اور کیا ہوسکتی ہے، سمینار سہ روزہ تھا، شرکاء

کی تعداد غیر معمولی تھی لیکن حسن انتظام اور مہمانوں کے اکرام میں کہیں کمی نہ تھی، دردمندی، ہوش مندی کے ساتھ ہنر مندی بڑی نعمت ہے، حیدرآبادی مہمان نوازی کا زمانہ قائل ہے اور یہ اس تہذیب کا آئینہ ہے جس کی ساری جلا صرف ایک لفظ یعنی شرافت میں مضمر ہے۔ شکر ہے کہ حیدرآباد کی فضاؤں میں آج بھی اسی تہذیب کی بوباس موجود ہے، میزبانوں میں گویا سارا حیدرآباد شامل تھا، مولانا رحمانی اور متعلقین معہد کے علاوہ اقبال احمد انجینئر، پروفیسر محسن عثمانی وغیرہ سے ہم آشنا تھے، ان کے علاوہ دوسرے مدارس اور اداروں کے ذمہ داروں کو بھی سرگرم پایا، یہ بھی حیدرآباد کی خصوصیت ہے کہ مسلک ومنہج کی کثرت کے باوجود مقصد میں وحدت کی اہمیت اولیت رکھتی ہے، معہد کے لیے اس کا تربیتی نصاب ہی کیا کم ہے، دس سال میں اس نے فتاوی سراجیہ، فوائد ظہیریہ، تفسیرات احمدیہ، احکام القرآن، شرح معانی الآثار، الکافی اور الادلۃ الشرعیہ جیسے اہم مخطوطات ومطبوعات پر توجہ مرکوز کی گویا ایک نئے دائرۃ المعارف کے ذریعہ اصل کے نقش کو مٹنے نہیں دیا، دارالمصنفین کو مولانا خالد رحمانی نے تحفے میں سلم واستصناع احکام وتطبیقات، اجارہ احکام وتطبیقات، علمائے ہند کی اہم قرآنی خدمات، الاختلافات الفقہیہ بین الفقہاء الحنفیہ کے ساتھ قرآن مجید کے آسان ترجمہ وتشریح کا دیدہ زیب حصہ اول بھی عنایت کیا، ان تحفوں کے ساتھ خوش گوار یادوں کی سوغات کے لیے شکریے اور خیر جزاء کے کلمات دل اور زبان کا حق ہیں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا سیرت سمینار

یہ حسن اتفاق ہے کہ قرآن مجید سمینار کے چند دنوں بعد یعنی ۱۸-۱۷ فروری کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ عربی نے سیرت طیبہ پر "ادب السیرۃ النبویۃ العربی فی العصر الحدیث" کے عنوان سے ایک سمینار کا اہتمام کیا، سیرت طیبہ، اصلاً قرآن مجید کی عملی تفسیر ہے، ان دونوں کو فکر ونظر اور فعل وعمل کا محور بنانے کی تاکید حجۃ الوداع کے آخری خطبہ نبویؐ سے ظاہر ہے۔ شعبہ عربی کے اس سمینار کا موضوع اس لحاظ سے منفرد تھا کہ اس میں معاصر عربی ادب میں ادب سیرت کے جلوؤں کی تلاش مقصود تھی، جدید عربی ادب سیرت میں حسنین ہیکل، معروف الرصافی، عباس محمود العقاد، طٰہٰ حسین، محمد ابوزہرہ، سعید البوبطی، سید قطب شہید، اکرم ضیاء العمری، عبدالقدوس انصاری، محمود شیث خطاب، احمد تیمور، عائض القرنی، شوقی ضیف، مصطفی سباعی، رشید رضا، محمد الغزالی، عبدالرحمٰن شرقاوی، عبدالرحمٰن عزام، بنت الشاطی، حسن البناء اور محمد نائف زین العابدین وغیرہ مشہور وممتاز نام ہیں، عربی زبان کے ہندوستانی سیرت نگاروں میں مولانا سید

ابوالحسن علی ندویؒ، ڈاکٹر حمید اللہؒ اور مولانا صفی الرحمن مبارک پوریؒ کا معاصر عربی ادب سیرت میں اہم مقام ہے، مقالہ نگاروں نے ان ہی کتابوں کو بحث و مطالعہ کا موضوع بنایا، مسرت کی بات یہ تھی کہ مختلف یونیورسٹیوں کے عربی شعبوں سے تعلق رکھنے والوں نے عربی زبان ہی میں مقالات پیش کیے، اردو میں بس چند مقالے پڑھے گئے، وائس چانسلر کی افتتاحی تقریر اور سعودی سفارت خانے کے باذوق ثقافتی نمائندے ابراہیم بطشان کے صدارتی خطبے نے سمینار کی وقعت میں اضافہ کیا، اس مبارک علمی مجلس کو پروفیسر کفیل قاسمی، پروفیسر صلاح الدین عمری، پروفیسر مسعود انور کاکوروی، پروفیسر فیضان بیگ نے جس محبت، محنت اور خوبی سے آراستہ کیا وہ واقعی داد کے لائق ہے۔

شبلی ڈگری کالج کا سیرت سمینار

اس سال فروری کا مہینہ، ربیع الاول کی مطابقت سے سعادتوں سے سرشار رہا، علی گڑھ کے بعد عصری تعلیم کی ایک اور نامور دانش گاہ شبلی ڈگری کالج نے ۲۷-۲۶ر فروری کو ذکر رسولؐ کی مجلس کا اہتمام کر کے اپنی سرخ روئی کا سامان کیا، ذکر رسولؐ کی رفعت، مطالعہ و تحقیق کے خدا جانے کتنے آفاق و ابعاد کی یافت و سیر کی ضامن ہے، شبلی کالج کے لائق پرنسپل ڈاکٹر افتخار احمد اور شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر شباب الدین کے فکر کی جدت و جولانی نے سمینار کے لیے ’عالمی زبانوں میں سیرت نگاری‘ کے موضوع کا انتخاب کیا، ادب سیرت کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس موضوع کی اہمیت و افادیت ظاہر ہے لیکن اس کے لیے تیاری بھی اسی درجہ سخت محنت کی طالب ہے لیکن نیت خالص ہو اور عزم کے ساتھ جزم کی صفت ہو تو مقصد کا حصول آسان بنادیا جاتا ہے، اس سمینار کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، مصر کے پروفیسر احمد عبدالقادر شاذلی، ڈاکٹر یسری احمد زیدان، پروفیسر جلال السعید الحفناوی، ڈاکٹر ہویدا عزت محمد، سعودی عرب کے ابراہیم محمد البطشان، افغانستان کے پروفیسر عبدالخالق رشید، ماریشس کے ڈاکٹر رحمت علی، پاکستان کے ڈاکٹر قمر اقبال کی شرکت سے اس سمینار کو عالمی شان ملی وہیں پروفیسر عبدالحق، پروفیسر شریف حسین قاسمی، مولانا عنایت اللہ سبحانی، ڈاکٹر صلاح الدین عمری، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی، جناب محمود حسن الہ آبادی، قاضی سید مشتاق علی ندوی، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، ڈاکٹر ایس ایم باسو، ڈاکٹر ایاز احمد اصلاحی، پروفیسر غلام رسول ملک، پروفیسر اقبال قریشی، پروفیسر علی محمد نقوی، پروفیسر عبدالمجید، مولانا رفاقت حسین قاسمی، ڈاکٹر عبدالماجد قاضی، ڈاکٹر بلرام شکلا وغیرہ نے علمی وقار میں اضافہ کیا، دارالمصنفین، کالج، مدرسۃ الاصلاح،

جامعۃ الفلاح کے نمائندے تو گویا میزبان ہی تھے، اردو، عربی، فارسی، ہندی، انگریزی، پشتو، مراٹھی، بنگلہ، چینی، سنسکرت، فرانسیسی جیسی زبانوں کے ادب سیرت کا یہ مطالعہ نہایت دلچسپ اور معلومات سے لبریز تھا، غیر ملکی مہمانوں نے خاص طور پر اعظم گڑھ جیسے دور دراز قصباتی شہر میں دارالمصنفین اور شبلی کالج کے وجود کو محبت وعقیدت کی نظر سے دیکھا اور زبان نے اعتراف کیا کہ ساری برکت سیرت النبی کی ہے اور یہ فیض سیرت نگار اعظم علامہ شبلیؒ کا ہے کہ آج اعظم گڑھ کا شمار اسلامی تاریخ کے روشن ترین شہروں قاہرہ، بغداد، دمشق وقیروان، قرطبہ واشبیلیہ، تاشقند وبخارا، شیراز واصفہان، دہلی ولکھنؤ اور لاہور وحیدرآباد کی صف میں ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی تعلیم - مسائل وامکانات، سمینار

مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق شکر ہے، اب پورے ملک میں ایک فکر اور بیداری کا احساس عام ہے، قوم وملت کی زبوں حالی اور پس ماندگی کا تعلق صرف سیاست اور معیشت تک محدود نہیں، مذہبی وملی ساخت وشناخت اس کی زد میں ہے اور اس کا علاج صرف علم کے حصول میں ہے، اس مقصد کے لیے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل موومنٹ، مسلسل سرگرم عمل ہے، گذشتہ سال اس کی ایک کانفرنس جامعہ ہمدرد دہلی میں ہوئی تھی، اس سال اس کے انعقاد کے لیے دارالمصنفین کا انتخاب کیا گیا اور اس کی ذمہ داری شبلی کالج کے ایک لائق فرزند اور سابق استاد کیمیا جناب صفی احمد انصاری کو دی گئی، ان کی مہینوں کی محنت بلکہ جاں فشانی سے ۷-۶/ مارچ کو یہ سمینار منعقد ہوا اور اس شان سے کہ قریب تین سو مندوبین اس سمینار کے لیے ملک و بیرون ملک سے تشریف لائے، ان میں ملیشیا کے جناب طارق اعظم بھی تھے اور حقیقتاً اس بامقصد سمینار کے روح رواں بھی وہی تھے، دوسرے اہم شرکاء میں ناظم دارالمصنفین پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، جناب رام نیپانی، مولانا مستقیم احسن اعظمی، ڈاکٹر رضوان فلاحی (برطانیہ) جناب ابرار احمد اصلاحی (سعودی عرب)، جناب جاوید احمد سابق وزیر مہاراشٹر وغیرہ تھے، سمینار کی کل چار نشستوں میں تعلیمی مسائل، حکومت کی تعلیمی پالیسیوں، منصوبوں، اساتذہ کے تربیتی مراکز پر گفتگو ہوئی اور خاص طور پر حکومت کے منصوبوں اور اسکیموں سے باخبر رہنے کی ضرورت کا احساس کرایا گیا، عربی ودینی مدارس کی فعالیت اور ان کے کردار کا بھی جائزہ لیا گیا، مسلمان بچیوں میں تعلیمی رجحانات کے اضافہ پر توجہ دی گئی، جدید مضامین خصوصاً تکنیکی تعلیم کے متعلق ماہرین کے مشورے بھی زیر بحث آئے، اس لحاظ سے یہ تعلیمی مذاکرہ کامیاب رہا کہ کچھ مثبت نظریے اور کچھ عملی تدبیریں سامنے آئیں، جن سے خوشگوار نتائج کی بہتر توقعات کو تقویت ملی۔

اخبار علمیہ

برطانیہ کی خبر ہے کہ گذشتہ چار برسوں میں وہاں پانچ لاکھ مسلمانوں کا اضافہ ہوا ہے اور اس وقت وہاں مسلمانوں کی کل تعداد ۲۵ لاکھ ہے، ''ٹائم میگزین'' نے اس اضافہ کے متعلق ماہرین کے حوالے سے تین اسباب گنائے ہیں، اول یہ کہ دوسرے ملکوں اور علاقوں سے آنے والے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ، دوسرے شرح ولادت میں اضافہ، تیسرے خود برطانوی باشندوں کا مذہب اسلام کی جانب میلان، رپورٹ کے مطابق وہاں بنگلہ دیشی ۷ء۴ اور پاکستانی ۳ء۴ فیصد ہیں اور اس طرح وہاں کے مسلمانوں میں ایک تہائی بنگلہ دیشی اور پاکستانی ہیں، برطانیہ کے ۴ فیصد مسلمانوں کی عمر ۶۵ برس سے زیادہ ہے، مسلمانوں کی بڑھتی تعداد پر اظہار خیال کرتے ہوئے آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیوڈ کولمان نے کہا کہ تعداد میں اضافہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سب کچھ درست ہے، اس لیے کہ محض تعداد میں اضافہ ہی نہیں، علمی، تعلیمی اور سیاسی میدانوں میں ترقی ضروری ہے، بے روزگار ۳۶ فیصد ہیں جب کہ مسلم خواتین میں بے روزگاری کی شرح ۶۹ فیصد ہے، ۶۸ فیصد مسلمانوں کی مالی حالت نہایت کمزور ہے، غریب خاندانوں کی شرح ۳۷ فیصد ہے، ۱۹ فیصد مسلمانوں کا انحصار حکومت کی سماجی امداد پر ہے، ۲۴ فیصد مسلمان نہایت گنجان آبادی میں بود و باش رکھتے ہیں، ثانوی تعلیم میں مسلمان پانچ مضامین میں کامیابی حاصل کر پاتے ہیں اور ان میں بنگلہ دیشی اور پاکستانی مسلمانوں کا تناسب سب سے زیادہ ہے، یونیورسٹی تک کی تعلیم حاصل کرنے والوں کی شرح ۱۷ فیصد ہے جن میں خواتین ۸ فیصد ہیں، ۴۳ فیصد بنگلہ دیشی وہ ہیں جو یونیورسٹی گریجویشن تک کی تعلیم حاصل نہیں کر پاتے، سیاسی نمائندگی بھی اطمینان بخش نہیں ہے، پارلیمنٹ میں ۲۵ لاکھ مسلمانوں کے صرف ۸ مسلمان نمائندے ہیں، جن میں ۵ مرد اور ۳ خواتین ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی حالت میں بہتری کی ضرورت ہے، برطانیہ کے جمہوری نظام میں بہر حال مواقع ہیں، ضرورت صرف صحیح حکمت عملی اور دور اندیشی کی ہے، سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ برطانوی نومسلموں کی ۸۰ فیصد تعداد اسلام کے بارے میں صحیح معلومات سے ناواقف ہے۔

۱۷۵۹ء میں بہار میں پیدا ہونے والے دین محمد ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم تھے، ۱۷۸۲ء میں گاڈفری ایون بیکر کے ساتھ برطانیہ کے شہر کارک چلے گئے اور شادی کرکے برائٹن منتقل ہوگئے اور یہیں ان کا انتقال ہوگیا، ۱۷۹۴ء میں انہوں نے انگریزی میں ایک کتاب The Travels of Deen Mohd لکھی اور یہ کسی ہندوستانی کی انگریزی میں لکھی گئی پہلی کتاب ہے جو برطانیہ سے شائع ہوئی، دین محمد نے ۱۸۲۱ء میں محمدس باتھس نام سے حمام کی بنیاد ڈالی جس میں شیمپو اور نہانے سے قبل مالش یا مساج کا استعمال کیا جاتا تھا۔ شاہ جارج چہارم اور ولیم چہارم برائٹن اسی مقصد سے آتے تھے، معلوم ہوا کہ شیمپو سے نئی دنیا کا تعارف ایک ہندوستانی مسلمان کے ذریعہ ہوا۔

آسٹریلیا، سری لنکا، برازیل اور پاکستان میں جو تباہ کن زلزلے آئے اس پر محققین نے یہ پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ درجۂ حرارت میں اضافہ اس تباہی کا کس قدر ذمہ دار ہے، یونیورسٹی آف وکٹوریہ کے محقق فرانسس زویئر نے ثابت کیا ہے کہ اس کا اہم سبب درجۂ حرات ہے انہوں نے یورپ، شمالی امریکہ اور براعظم ایشیا میں 1951ء سے ۲۰۰۰ کے دوران پیش آنے والے واقعات کے اعداد و شمار جمع کیے گئے جن سے معلوم ہوا کہ ان برسوں میں موسم زیادہ شدید اور گرم رہا ہے، زویئر کے مطابق ہوا میں پانی کی تعداد کا زیادہ ہونا اس کی بڑی اور اہم وجہ ہے، یہ تحقیق ڈوئچے ویلے کے شعبۂ اردو کی سائٹ پر موجود ہے۔

ٹائمس آف انڈیا کے حوالے سے ''اے مسلم'' جنوری میں روزنامہ ''مسلمان چینئی'' کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ یہ اردو کا قدیم ترین اخبار ہے اور ۴ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے، ۱۹۲۷ء میں سید عظمت اللہ نے جاری کیا تھا اور اس کا افتتاح انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے کیا تھا، اس کا صدر دفتر چینئی کے ٹریلکین ہائی کورٹ پر واقع ایک عمارت میں ہے اور غالباً جدید تکنیکی دور میں یہ واحد طویل العمر اردو اخبار ہے جو دستی کتابت کی روایت پر قائم ہے۔ مدیر اول کے انتقال کے بعد اس کی ادارت سید فضل اللہ کے ہاتھ میں آئی، ۲۶ رفروری ۲۰۰۸ء میں ان کی وفات ہوگئی، اس وقت ان کے صاحب زادے سید نصر اللہ مدیر ہیں، اس کے خصوصی نمائندہ سوامی بالا سبرامنین ہیں، ملازمین میں خواتین اور غیر مسلم بھی ہیں، کاتبوں کی نصف تعداد خواتین ہی پر مشتمل ہے، مسلم مسائل کے ساتھ اس میں ایسی خبروں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے

جن میں مسلمانوں کی ترقی کا ذکر ہو، اس کی اشاعت بیس ہزار کے قریب ہے اور دہلی، کولکاتا اور حیدرآباد میں اس کے نمائندے پھیلے ہوئے ہیں۔

۱۴ر برس کے عبدالکلام کا تعلق بہار کی سرزمین سے ہے، حیرت انگیز طور پر وہ نالی کے گندے پانی کو قابل استعمال بنانے کے منصوبے پر پچھلے کئی ماہ سے غور و تجربہ میں مصروف ہے، اگر یہ پروجیکٹ کامیاب ہوجاتا ہے تو آبی وسائل کی قلت اور آبی آلودگی سے اس علاقہ کو محفوظ کیا جاسکتا ہے، جب اس کا علم وزارت فروغ انسانی وسائل کو ہوا تو اس نے اس منصوبہ پر عمل آوری کا جائزہ لینے کے لیے ایک وفد تشکیل دے کر پٹنہ روانہ کیا ہے، واضح رہے کہ عبدالکلام کو صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے یوم قومی اطفال ایوارڈ سے نوازا گیا ہے، یہ ایوارڈ ۳۰ غیر معمولی ذہین بچوں کے لیے خاص تھا۔

سائنسی جریدہ ''کرنٹ بایولوجی'' کی اطلاع کے مطابق برطانوی سائنس دانوں نے ایک ایسا کمپیوٹر ایجاد کیا ہے جو یہ بتادے گا کہ کوئی شخص کیا سوچ رہا ہے، تحقیق کے دوران جب افراد کا دماغ اس کمپیوٹر سے منسلک کیا گیا تو اس نے طرز فکر کی وضاحت اور یادداشت تک رسائی حاصل کرکے اس کی تشریح کی، یونیورسٹی کالج آف لندن کی محقق ایلی نور بیگ واٹر کا کہنا ہے کہ اس کامیاب تجربہ کا مطلب یہ ہے کہ دماغ کو کمپیوٹر کے ذریعہ پڑھا جاسکتا ہے، اس تحقیق کے لیے دماغ کے ایک چھوٹے حصہ ''ہپوکیمپس'' پر توجہ مبذول کی گئی، یہ یادداشت میں اہم کردار ادا کرتا ہے، یادداشت کے کام کا طریقہ معلوم ہوا تو جھوٹ کا پتہ لگانے کا تجربہ کیا گیا، درست نتائج اخذ کرنے کے لیے کامیابی کی شرح فی الحال ۴۵ فیصد ہے، آئندہ مزید بہتر نتائج کی توقع ہے۔

برمنگھم کے علاقہ سینڈول کی ۱۵ سالہ طالبہ کو فیس بک کے جس ویڈیو میں قرآن نذر آتش کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا، اب اس حصے کو نکال دیا گیا ہے اور اس فاتر العقل لڑکی کو گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا ہے۔

ک ۔ ص ۔ اصلاحی

معارف کی ڈاک

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج،
پوسٹ بسواریا، وایا لوریا،
مغربی چمپارن، بہار۔
۱۰/۳/۱۱ء

محترمی السلام علیکم

امید ہے آپ بہ ہمہ وجوہ خیریت سے ہوں گے۔

معارف جنوری ۲۰۱۱ء کے شذرات، مقالات، اخبار علمیہ اور مطبوعات جدیدہ پر تبصرے بصیرت افروز، فکر انگیز، معلومات افزا اور دل کش و خوب صورت ہیں۔ ''اسلوب احمد انصاری، شخصیت، تنقید اور انداز تحریر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے پروفیسر عبدالرحیم قدوائی صاحب کے حوالے سے یہ بات بالکل درست تحریر فرمائی ہے کہ انگریزی ادب کے ایک بالغ نظر عالم ہونے کے باوصف، اسلام، نبی آخر الزماں ﷺ کی ذات اقدس اور ان کی تعلیمات کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری بھی اسلوب احمد انصاری کا ایک نمایاں وصف ہے۔ انصاری صاحب کی اسلامی دینی غیرت و حمیت تو لائق تقلید بھی ہے اور قابل رشک بھی۔

پروفیسر مختار الدین احمد آرزو صاحب نے ایک بار انصاری صاحب کے ذکر میں فرمایا:

> ''دینی غیرت و حمیت میں اسلوب احمد انصاری صاحب اپنی مثال آپ ہیں۔ کچھ دن ہوئے خواجہ مشفق مرحوم علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ میں نے ان کے اعزاز میں علی گڑھ کے ممتاز اہل علم کو مدعو کیا۔ پروفیسر مسعود حسین اور پروفیسر......الاسلام پہلے پہنچ گئے تھے اور ''لان'' میں بیٹھ کر مصروف گفتگو تھے۔

کچھ دیر کے بعد پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب بھی تشریف لائے۔
دروازے کے باہر سے انصاری صاحب دونوں صاحبان کو مصروف گفتگو دیکھ کر
الٹے پانو واپس جانے لگے۔ میں (آرزو صاحب) نے ان کا ہاتھ پکڑا اور عرض
کیا کہ آپ اندر تشریف لے چلیں۔ اسلوب احمد صاحب نے فرمایا:
''جس مجلس میں...... الاسلام جیسا وحدانیت و رسالت کا منکر ہو، اس
مجلس میں، میں شریک نہیں ہو سکتا''۔
یہ کہہ کر اسلوب احمد صاحب واپس چلے گئے''۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب کا ایک ممتاز وصف یہ بھی ہے کہ وہ بڑے باصول آدمی ہیں۔ آرزو صاحب کی روایت ہے کہ پٹنہ سے پروفیسر عبدالمغنی مرحوم کا انگریزی کا ایک تحقیقی مقالہ جانچ کرنے کے لیے پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب کے پاس آیا تھا۔ عبدالمغنی صاحب نے آرزو صاحب کو مطلع کیا کہ آپ سفارش کردیں لیکن اسلوب صاحب نے دوستی کے باوجود آرزو صاحب کی سفارش ان سنی کردی اور اتنے ہی نمبرات دیے جتنے کا مستحق عبدالمغنی صاحب کا مقالہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوبارہ مقالہ لکھ کر عبدالمغنی صاحب کو اپنی مطلوبہ ڈگری لینی پڑی۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب کے گہرے دوستوں میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحبؒ بھی تھے۔ ایک بار ان کی مجلس میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب کا ذکر آیا تو ڈاکٹر صاحبؒ نے فرمایا:

''علی گڑھ کے ایک مشہور ناقد و ادیب پر ایک کتاب ترتیب دی گئی
ہے۔ ایک دن میں نے اسلوب احمد انصاری صاحب سے عرض کیا کہ آپ بھی
اس کتاب پر کچھ تحریر فرمادیں۔ انصاری صاحب نے فرمایا:
جس صاحب علم کی علمی، ادبی اور تنقیدی صلاحیتوں اور کارناموں کے
اعتراف میں یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے، اس صاحب علم کی ''تنقیدی بصیرت''
میرے نزدیک محل نظر ہے۔ اس لیے اس کتاب پر میں کچھ نہیں لکھ سکتا''۔

ڈاکٹر صاحب نے اتنا فرمایا کہ صاحب علم کو اتنا سخت گیر اور خود پسند نہیں ہونا چاہیے۔

بہر حال پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ایک بالغ نظر عالم، ممتاز تنقید نگار، بااصول انسان اور راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے بہت ممتاز اور مغتنم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو دیر تک زندہ رکھے اور علمی خدمات انجام دینے کا موقع عنایت فرمائے۔ آمین!

والسلام

نیازمند وارث ریاضی

دائرۃ المعارف العثمانیہ

Head, Dept of Arabic Literature
The English & Foreign
Languages University,
Hyderabad-500605

۴؍ جنوری ۲۰۱۱ء

محترم جناب محمد عمیر صدیق ندوی صاحب

سلام مسنون، امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے سمینار کا دعوت نامہ ملا تھا۔ موضوع میری دلچسپی کا تھا اور میں شریک بھی ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اب اسی مہینہ مجھے ایک سمینار میں ریاض سعودی عرب بھی جانا ہے۔ اس لیے معذرت کرنی پڑی۔

دائرۃ المعارف العثمانیہ کے حالات ناگفتہ بہ ہیں ۱۵ کارکنوں کو اس بنا پر نکال دیا گیا کہ تنخواہ دینے کے لیے فنڈ نہیں ہے۔ جو ڈائرکٹر ہیں وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں کامرس پڑھاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ حالات کا علم تمام اہل علم کو ہو جائے اگر قریبی اشاعت میں حالات علمیہ کے تحت اسی مضمون کی اشاعت ہو جائے تو بہتر ہے تاکہ اہل علم اس ادارہ کو سنبھالنے کی فکر کریں۔

والسلام محسن عثمانی

ادبیات

غزل

جناب وارث ریاضی صاحب

زندگی شہر تمدن میں بسر ہونے تک
مدتیں کتنی گزرتی ہیں بشر ہونے تک

وادی عشق کے بے خوف و خطر ہونے تک
کون جیتا ہے دعاؤں میں اثر ہونے تک

کون جانے کہاں؟ کس حال میں رہنا ہوگا؟
شام غربت ، شب ہجراں کی سحر ہونے تک

اک ترے غم کا سہارا ہے جیے جاتے ہیں
ہم کہاں ہوں گے محبت کی نظر ہونے تک

کون جانے کہ زمیں کس کا بسیرا ہوگی؟
ماہ و مریخ پہ انسان کا گھر ہونے تک

کیوں نہ ہم کنج قفس ہی کو سجالیں ہم دم!
ٹوٹ جائیں نہ کہیں پیر بھی پر ہونے تک

ہو نہ جائے دل دیوانہ کہیں شایستہ
حسن معصوم میں وحشت کا اثر ہونے تک

یہ تو غنچے ہیں ابھی راز نمو کیا جانیں؟
جلوۂ حسنِ چمن ہے گلِ تر ہونے تک

ہم نے سیراب کیا دل کے لہو سے وارث
غم کے پودوں کو ثمر دار شجر ہونے تک

کاشانۂ ادب، سکلادیوراج، پوسٹ بسواریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار۔

مطبوعات جدیدہ

تحقیق و تدوین مسائل و مباحث: از پروفیسر حنیف نقوی، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۲۸، قیمت ۳۰۰ روپے، پتے: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲، نوری بک سیلرز، دال منڈی، وارانسی ۲۲۱۰۰۱، اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی عزیز الدین وکیل، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

تحقیق کیا ہے اور تدوین کیوں کر ہو؟ اس سوال کا جواب زیر نظر کتاب کے مختلف مضامین میں جس خوبی کے ساتھ دیا گیا ہے، اس کی وجہ سے یہ اپنے موضوع پر اردو کی چند اہم کتابوں میں نہایت قابل قدر اضافہ ہے، اصلاً یہ فاضل مصنف کی بیس سالہ محنت اور تجربہ کا عطر ہے، تحقیق اور اصول تحقیق کی باریکیوں پر مصنف کی دقت نظر کا اعتراف اہل نظر کو ہمیشہ رہا، وہ اردو کے ان معلمین و مدرسین کے اس طبقے سے ہیں جو اب گویا عنقا ہوتا جاتا ہے، جن کو یہ احساس ہے کہ دانش گاہوں میں تدریسی متن سے روز افزوں بے اعتنائی کے ساتھ ساتھ تحقیق و تدوین کی روایت بھی مسلسل کمزور ہوتی جارہی ہے، اسی احساس نے ان کے قلم کو مسلسل ان نکات کی توضیح و تشریح کی توفیق دی جن کو اگر مدنظر نہ رکھا جائے تو تحقیق کے مراحل طے ہوسکتے ہیں نہ تدوین کا حق ادا ہوسکتا ہے۔ چونکہ ان کو تحقیق کی یہ معرفت حاصل ہے کہ تحقیق، حقائق کی بازیافت کا عمل ہے، اس لیے محقق کا منصب بھی اسی درجہ انہماک اور دقت نظر کا طالب ہے، بازیافت کے لفظ کو استعمال کر کے انہوں نے نہایت پر معنی تعبیر پیش کردی کہ ماضی کے دامن میں پناہ لینے والے واقعات، گردش روز و شب سے صرف غبار آلود ہی نہیں ہوتے وہ رفتہ رفتہ دائرہ علم سے بھی باہر ہوجاتے ہیں، ان کو از سر نو منظم و مربوط کرنا ہی تحقیق عمل ہے، اس عمل میں اعلان حق کا جتنا اہتمام ہوگا، حق اسی درجہ واضح ہوگا، تحقیق کے لیے تشکیکی مزاج اور صبر دو اہم مطلوب عنصر ہیں اور مصنف بھی ان عناصر کے موید ہیں کہ عجلت اور سہل پسندی کی جگہ، تحقیق میں نہیں انکشاف حقائق اور استخراج نتائج ان دونوں سے تحقیق کا مرحلہ طے ہوتا ہے اور یہ دونوں ہی صبر طلب ہیں ۔اس اجمال کی تفصیل میں انہوں نے عام اہل تحقیق بلکہ بعض نامور محققین کے حسن و قبح کی

مثالیں پیش کی ہیں، مثلاً پہلے ہی مضمون میں غالب کے دونوں تخلص، اسد اور غالب کے متعلق، مہر و عرشی کی تحقیق، مرزا حاتم علی بیگ مہر کے مولد اور رجب علی بیگ سرور کے موطن کی روایت، تذکرہ ریختہ گویاں کی بے احتیاطی پر ان کی محققانہ نظر اور رائے کا اصابت کی ساتھ اظہار کی جرأت کا بھی اندازہ ہوتا ہے جیسے مولوی عبدالحق کے متعلق یہ رائے کہ انہوں نے دریائے لطافت میں کئی ایسے مقامات پر تحریف و تصرف کو جائز رکھا جہاں ان کو انشا کی رائے سے اختلاف تھا، ایسی صورت میں ان کے ایڈیشن کا پورا متن ہی مشکوک ہو جاتا ہے، اسی مضمون میں یہ بڑے کام کی بات آگئی ہے کہ محقق کو کوئی نیا دعویٰ کرنے یا کسی مسلمہ کو رد کرنے سے پہلے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کر لینا چاہیے، ایسا نہ کرنے سے بعض محققین نے جو غلطیاں کی ہیں، ان کی مثال بھی دی گئی، ایک اور اہم بحث معاصر شہادتوں کا اعتبار و استناد ہے کہ اس کے بغیر واقعات غیر معتبر ہو جاتے ہیں جیسے امیر خسرو سے منسوب پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں یا خواجہ معین الدین چشتی کا دیوان، اسی طرح تحقیق اور تدوین میں اصل نسخے کا انتخاب، تدوین کے عمل میں حد درجہ ضروری ہے، بنیادی نسخہ کن خصوصیات کا حامل ہو؟ اس کی وضاحت بڑی خوبی سے کی گئی اس ذیل میں متعدد مثالیں دی گئی ہیں جن سے قاری کی معلومات میں اضافہ تو ہوتا ہی فاضل مرتب کی شان جستجو بھی جلوہ گر نظر آتی ہے، اسی ضمن میں منشائے مصنف سے انحراف اور اس کے محرکات و اسباب کی بحث بھی آگئی، عام طور سے تاریخ گوئی اور تاریخی مادوں کی صحت پر کم نظر جاتی ہے لیکن یہ مشکل مضمون بھی بڑا دلچسپ بن گیا، ایسے ہی ترقیمہ، مہریں، عرض دید ایسے موضوعات ہیں کہ کم کسی نے اس انداز سے ان پر بحث کی ہوگی، جدید اردو قاری کے لیے یہ معلومات کسی نعمت سے کم نہیں، تاریخ نگاری کے اصول و آداب اور رشید حسن خاں کا نقطہ نظر، تدوین سحر البیان کے علاوہ جامعاتی تحقیق کے عنوان سے آخری مضمون تو تحقیق کے طالب علموں کے لیے شمع ہدایت ہے اور اس لائق ہے کہ تحقیقی مقالے لکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ لازم کر دیا جائے۔ کتاب کی ایک نمایاں خوبی اغلاط کتابت سے پاک ہونا بھی ہے، مضامین بھی اسی طرح حشو و زوائد اور اغلاق و ابہام اور خشکی اور روکھے پن سے پاک ہیں بلکہ اس میں سہل ممتنع کا سا لطف ہے، کتاب کا انتساب شیرانی و عرشی اور رشید حسن خاں و قاضی عبدالودود کے نام ہے اور بجا طور پر ہے لیکن ان کی عظمت اور ان سے

عقیدت کے باوجود، مضامین میں ان سے اختلاف اور ان کے بعض تسامحات پر گرفت کی موجودگی مصنف کے قول وفعل کی یکسانی کا ثبوت ہے۔

مکتوباتی ادب: از ڈاکٹر شمس بدایونی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۳۸، قیمت ۱۸۰ روپے، پتے: اردو بازار، جامع مسجد دہلی کا مکتبہ جامعہ اور کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بک ریویو 1739/3 نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس دریا گنج، نئی دہلی اور مکتبہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔

اس نہایت دلچسپ کتاب کے لائق وفائق مصنف نے ابتداء اس تنبیہ سے کی کہ یہ کتاب خطوط نگاری کے تاریخی وادبی ارتقاء کے متعلق کوئی تحقیقی کاوش نہیں بلکہ خطوط نگاروں پر مشتمل سات متفرق مقالات کا مجموعہ ہے لیکن غالب سے خود شمس بدایونی کے خطوط کے اس مجموعہ کو اگر صنف کے ارتقاء کی تاریخ سمجھا جائے تو غالباً یہ غلطی نہیں کہ مکتوباتی ادب کی بحیثیت صنف ادب، بنیاد اور اس کے منازل ارتقاء میں زیادہ فاصلہ نہیں، غالب بنیاد گزار بھی ہیں اور بام ارتقاء پر فائز کرنے والے بھی، ہاں اس بام پر جشن چراغاں جن سے ہوا ان میں علامہ شبلی، مہدی افادی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ہمارے لیے سب سے روشن ہیں گو اس آسمان کے مہر و ماہ اور بھی ہیں اور لائق مصنف نے اس کی ایک مثال داغ کی خطوط نگاری کے حوالے سے پیش بھی کردی ہے حالانکہ ان کے علم میں خطوط کے کثیر مجموعے ہیں اور ان کو یہ احساس بھی ہے کہ سب نہ سہی خطوط مشاہیر کے مجموعوں کو تحقیقی وتدوینی طور پر مرتب کیا جائے، غالب خوش نصیب ہیں کہ اصل اعتناء ان کے ساتھ ہوا، ان کے بعد اقبال اس میدان میں بھی ہم راہ نظر آتے ہیں، شبلی کی مکتوب نگاری، شبلی شناسوں کی نظر میں غالب سے جدا ہے، منفرد بھی اور غالب ہی کی طرح دلچسپ اور برجستہ وبے ساختہ بھی، ان کے چند سوانح نویسوں کے ہاں شبلی کی مکتوب نگاری کا ذکر بھی کیا گیا لیکن مکاتیب شبلی پر نقادوں اور محققوں نے وہ توجہ نہیں کی جو غالب واقبال کے حصے اور نصیبے میں آئی، لائق مصنف کو شدت سے یہ احساس ہے کہ شبلی کے سرمایہ مکتوبات پر بجز مولانا سید سلیمان ندوی کسی نے توجہ نہیں دی، اس کے ممکن اسباب بھی انہوں نے گنائے اور اس کی تدوین جدید کی ضرورت پر اس طرح اظہار خیال کیا کہ مکاتیب شبلی کی تاریخی، سوانحی اور علمی وادبی اہمیت کو

بیان کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مولانا شبلی کی زندگی کے بیش تر واقعات کی سلسلہ وار ترتیب اور ان کا زمانی تعین ان خطوط کے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں، اس کے بعد انہوں نے خطوط شبلی کے موجود نسخوں، ان کی ترتیب و اشاعت کا ایسا جائزہ لیا جو واقعہ ہے اس شرح و بسط و تلاش و جستجو سے اب تک نہیں ہوا تھا، انہوں نے شبلی کے موجود تمام خطوط کا جائزہ لے کر بتایا کہ یہ ایک ہزار تین میں یعنی مکاتیب شبلی کے قریب ۷۸۱ خطوط کے علاوہ دوسرے مجموعوں اور رسائل و کتب میں منتشر قریب ۲۰۰ مکاتیب اور بھی ہیں، اس کے بعد اس تمام سرمایہ خطوط کی تدوین جدید کے بارے میں ان کی رائیں اور تجویزیں دراصل دارالمصنفین کے ذمہ داروں کے لیے ہیں کہ ان تجویزوں کی روشنی میں کلیات مکاتیب شبلی کی تدوین خصوصاً متنی تدوین میں وہی اصول اپنائے جائیں جو مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود جیسے محققین و مدونین کے پیش نظر رہے، شبلی پر ان کا یہ مضمون خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد کا تحقیقی جائزہ کے بعد ہے، حالانکہ لائق مصنف کے غیر معمولی ذوق تفحص اور وسعت مطالعہ کا یہ مضمون اعلیٰ نمونہ ہے، موضوع کا ایسا مکمل احاطہ کم ہی نظر آتا ہے لیکن سب سے دلچسپ داغ کے خطوط کا معاملہ ہے جن کے متعلق مکتوباتی ادب کے شائقین خصوصاً آج کے اردو قارئین کو کم معلوم ہے کہ ''اس صنف کو رنگینی و شوخی سے آمیز کرنے اور اس کے فطری پن کو زندگی کی حرارت اور جذبات کی تمازت سے مملو کرنے میں داغ کے خطوط کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا'' داغ کے خطوط کا پہلا مجموعہ قریب ۶۰ سال پہلے خطوط داغ کے نام اور دوسرا مجموعہ پہلے مرتب احسن مارہروی کے صاحبزادے رفیق مارہروی نے زبان داغ کے نام سے مرتب کیا، یہ خطوط اعزہ، احباب، تلامذہ، والیان مملکت کے نام ہیں، کچھ خطوط ان کے نام بھی ہیں جن کی مملکت دل پر خود داغ کی حکمرانی تھی اور یہی وہ خطوط ہیں جہاں داغ کے داغہائے سینہ چمک اٹھے ہیں، تخاطب کے عجب انداز ہیں، دل دار و دل نواز، نیک بخت پاک دامن بے لوث، ملکہ اقلیم سخنوری، بنارس کی صنم کلکتے کی پری دام جمالہا و کمالہا، دل ربا سخن آراء، حور لقا، پری ادا، حور کی صورت، نور کی مورت، ان عنوانوں سے مضامین کی شوخی و رنگینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، زبان کا رنگ داغ سے زیادہ کس پر نکھر سکتا ہے، ایک خط ہی اس کے لیے کافی ہے کہ ''کاش اس قدر میں دیدار حق کا مشتاق ہوتا، میں نے پہلے سنا تھا کہ قرآن اٹھ گئے ہیں، عہد و پیمان ہو گئے ہیں مجھ سے نہ ملنے کے، اب یقین ہوا کہ

بائی جی کو جی لگالینا آتا ہے، لگا رکھنا نہیں آتا''یہی رنگ، تلامذہ کے نام خطوط میں نمایاں ہے، بقول مصنف داغ کے تعلق میں اخلاص و محبت ہے، شفقت و ہمدردی ہے، رواداری بھی ہے اور وضع داری بھی، دوستانہ بے تکلفی بھی ہے اور راز درون پردہ میں ان کی شرکت بھی، ان خطوط کے انتخاب میں مصنف کا حسن ذوق بھی کھل اٹھا ہے بالکل درست لکھا گیا کہ داغ نے ۱۸۶۰ سے ۱۹۰۴ تک تقریباً ۴۵ سال علم و ادب کی دو سرپرست ریاستوں رام پور اور حیدرآباد میں عیش و عشرت، عزت و وقار سے بھرپور زندگی کا جو لطف کشید کیا ان کی شاعری کی طرح ان کے خطوط بھی اس کا ترجمان بن گئے، محقق مصنف محض تحقیق کے بے آب و گیاہ صحرا کے خوگر نہیں، انہوں نے غالب و شبلی سے زیادہ داغ کے خطوط کے اقتباسات دیئے تو وجہ بھی ہے کہ داغ کی نجی زندگی، ہم عصر حالات اور شخصیت کے نکھار کا رنگ و نور جو نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے ان کی شاعری کی طرح اس کا بھی احیاء ہو اور ان کو پڑھنے کے بعد اس شعر کا اصل لطف اٹھایا جاسکے کہ

داغ اک آدمی ہے گرما گرم
خوش بہت ہوں گے جب ملیں گے آپ

اردو مکتوب نگاری میں مختار الدین آرزو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، انہوں نے خود جس کثرت سے خطوط لکھے، اس کی مثال نہیں ملتی لیکن اس سے بھی زیادہ یہ حقیقت اہم ہے کہ مکتوبات کے جمع و ترتیب و تدوین و تحشیہ کو بھی انہوں نے ایک مستقل علمی مشغلہ بنایا، ان کی اس خصوصیت پر شامل تحریر بھی بڑی وقیع ہے، تحریریں اور بھی ہیں جیسے مشاہیر کے مکاتیب کے حصول و حفاظت اور مکاتیب شمیم اور خود مصنف کے بعض اہم خطوط، سچ یہ ہے کہ اس کتاب کی جامعیت، خصوصیت اور مصنف کے مشوروں اور گزارشوں پر اور تفصیل سے گفتگو کی جاتی اور باب التقریظ والانتقاد کے تحت اس کا ذکر آتا لیکن مسلسل معارف کے صفحات کی تنگ دامنی سے مناسب یہی سمجھا گیا کہ اپنے موضوع پر اس نہایت مفید، معلومات افزا، دلچسپ اور تحقیق و تدوین کے اصول پر کھری اترنے والی کتاب کے ذکر میں تاخیر نہ کی جائے، ایسی دلکش کتاب پیش کرنے کے لیے اردو دنیا کا حق ہے کہ وہ تحسین و آفریں کے تمام پھول نچھاور کردے۔

ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

۱-سریر کابری-شخصیت اور فن: داؤد اختر کابری، سید محمد داؤد اختر کابری، سریر منزل کریم گنج، گیا۔
قیمت ۱۳۶ روپے

۲-ربیعہ (دیوان رباعیات شاہ): شاہ حسین نہری، مامن مقصود کالونی، روشن گیٹ اورنگ آباد، دکن۔ قیمت ۱۵۰ روپے

۳-مطالعات سرسید (تعلیمی، سماجی و فقہی مسائل کے حوالہ سے): ظفر الاسلام، پبلیکیشنز ڈویژن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، قیمت ۱۲۵ روپے۔

۴-تحفۂ برما: سید محمود حسن حسنی، مکتبہ اسلام، رؤوف مارکیٹ، گوئن روڈ لکھنؤ، قیمت درج نہیں۔

۵-اردو کی کہانی اردو کی زبانی: پروفیسر محسن عثمانی ندوی، اردو اکیڈمی آندھرا پردیش، چوتھی منزل حج ہاؤز، حیدرآباد، اے پی، قیمت ۲۰ روپے۔

۶-ائمہ اربعہ کا دفاع اور سنت کی اتباع: نواب صدیق حسن خاں، مترجم مولانا محمد اعظمی، مکتبہ الفہیم مئو ناتھ بھنجن، یوپی، قیمت ۱۶۰ روپے۔

۷-گلدستہ خوش باس: اسلم مرزا، سب رس کتاب گھر، ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوہی جی گوڑہ، حیدرآباد، قیمت ۴۰۰ روپے۔

۸-مرکزی مدرسہ بورڈ اور اقلیتوں کی تعلیم: مولانا محمد ولی رحمانی، الہدایہ اسلامک ریسرچ سنٹر، جامعۃ الہدیٰ، جے پور، قیمت درج نہیں۔

۹-جلوۂ دانش فرنگ: عبدالرحیم قدوائی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ، یوپی، قیمت ۸۱ روپے۔

۱۰-ہندوستانی خطی میراث (فارسی، عربی اور اردو): چندر شیکھر، دی کتاب گھر، ۳۹۶۱، گلی خان خاناں، جامع مسجد دہلی، قیمت درج نہیں۔

۱۱-ادبیات محمود (اول): ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی، اسلم غازی سکریٹری ادارہ ادب اسلامی، مہاراشٹر، حامد بلڈنگ، ۹۶ حافظ علی بہادر مارکٹ ممبئی، قیمت ۲۰۰ روپے۔

۱۲-پروفیسر نور الحسن انصاری حیات اور فارسی خدمات: ڈاکٹر وکیل اشہر، فہیم بک ڈپو (صدر چوک)، مئو ناتھ بھنجن، قیمت ۱۵۰ روپے۔

۱۳-طیب عثمانی ندوی-افکار و اقدار: ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، مجلس مصنفین، بیت الرشاد، شانتی باغ، نیا کریم گنج، گیا، بہار، قیمت ۱۵۰ روپے۔